فہرست

شذرات

قومی سطح پر باہمی کشمکش کا حل — جاوید احمد غامدی/ منظور الحسن

قرآنیات

النساء (۴: ۱۶۶-۱۷۶) — جاوید احمد غامدی

معارف نبوی

مچھلی اور ٹڈی کا تذکیہ — ساجد حمید

دین و دانش

شرعی سزاؤں کی ابدیت و آفاقیت — محمد عمار خان ناصر

سیر و سوانح

ہجرت حبشہ — خالد مسعود

مقامات

قانون معیشت — جاوید احمد غامدی

یسئلون

متفرق سوالات — طالب محسن

متفرق سوالات — محمد رفیع مفتی

جاوید احمد غامدی
مرتب: منظور الحسن

قومی سطح پر باہمی کشمکش کا حل

[''آج'' ٹی وی کے پروگرام ''Live with ghamidi'' میں میزبان جناب ڈاکٹر منیر احمد کے ایک سوال کے جواب میں جناب جاوید احمد غامدی کی گفتگو]

ہمارے موجودہ قومی حالات پر ہر حساس آدمی پریشان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ملک ہی نہیں، پوری ملت اسلامیہ ایک سخت خطرناک صورت حال سے دوچار ہے۔ میں کبھی کبھی محسوس کرتا ہوں کہ جیسے یہ ملت بھی ایک بڑی سی لال مسجد ہے اور تمام مسلمان قومی سطح پر وہی کچھ کر رہے ہیں جس کا مظاہرہ گزشتہ دنوں لال مسجد اسلام آباد میں ہوا تھا۔ اس کے قائدین کو دیکھیں، ان کے طریق کار اور طرز استدلال کا جائزہ لیں، اس کے افراد کے جذبات اور محسوسات کا مطالعہ کریں تو بالکل ویسی ہی صورت حال سامنے آتی ہے۔ اس کے اسباب و وجوہ کیا ہیں، اس ضمن میں بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ زیادہ ضروری ہے کہ اس مسئلے کو اس کے حل کے پہلو سے دیکھا جائے۔ یعنی یہ جو کشمکش مذہبی طبقات میں اور سیکولر قرار دیے جانے والے طبقات میں جاری ہے، حکومتوں اور سیاسی گروہوں کے مابین جاری ہے اور عوام کے مختلف طبقوں میں جاری ہے، یہ کیسے ختم ہو سکتی ہے؟

میں برسوں اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کو ملحوظ خاطر نہ رکھنے کی وجہ سے جگہ جگہ کشمکش کے آثار پیدا ہوئے ہیں۔ ترکی ہو، انڈونیشیا ہو، ملائیشیا ہو، سعودی عرب ہو، افغانستان ہو، ایران ہو، پاکستان ہو، کوئی بھی مسلمان ملک ہو، انھی پانچ چیزوں کا عدم وجود کشمکش اور باہمی خلفشار کا باعث بنا ہے۔ یہ چیزیں اگر حاصل ہو جائیں تو پھر ہم مسائل سے نکل کر ترقی کی راہ پر گام زن ہو سکتے ہیں۔

پہلی چیز جمہوریت ہے۔ یہ ہمارے دین کا بھی تقاضا ہے اور دنیا بھی اپنے تجربات کے نتیجے میں اسی مقام پر پہنچی ہے کہ جمہوری معاشرہ فلاح انسانی کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت لوگوں کی رائے سے وجود میں آئے، لوگوں کی رائے سے قائم رہے اور لوگوں کی رائے سے محرومی کے بعد اپنا جواز کھو دے۔ کسی شخص کو یہ حق نہ دیا جائے کہ وہ آئین کو توڑ دے یا کوئی ماورائے آئین اقدام کرے۔ قومی سطح پر جو آئین، جو دستور، جو قاعدہ بنایا جائے، اسے قومی میثاق کی حیثیت حاصل ہو۔ سب لوگ اس کی عزت کریں، اس کا احترام کریں۔ وہ ایک مقدس دستاویز قرار پائے اور اسے پس پشت ڈالنے کو ہرگز گوارا نہ کیا جائے۔

حقیقی جمہوریت ہماری ضرورت ہے۔ اس کے ذریعے سے آپ کشمکش کو ختم کر سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کے اندر سے تشدد کے عنصر کو ختم کر کے ان کو اس راستے پر لا سکتے ہیں کہ وہ تبدیلی کے لیے رائے عامہ کو قائل کرنے کا طریقہ اختیار کریں۔ وہ ان کے ذہنوں پر، ان کے افکار پر اثر انداز ہوں اور اس طرح پر امن ذرائع سے تبدیلی لانے کے امکانات پیدا کریں۔ دیکھیے، تبدیلی لانا، سوسائٹی کو درست کرنا، یہ انسان کا حق ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ نظم ریاست اس کی امنگوں، اس کی آرزووں کے مطابق ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا طریقہ کیا ہے؟ اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہم اپنی قوم کو اس کا یہ حق دیں کہ مملکت کے تمام ادارے اس کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے۔ پارلیمنٹ کو حقیقی بالادستی حاصل ہو اور ایک ایسا جمہوری نظام قائم ہو جس میں مذاکرات ہو سکیں، جس میں مکالمہ ہو سکے، جس میں اختلاف کو برداشت کیا جائے۔ اس کے بعد مذہبی طبقات کو بھی یہ بات سمجھائی جا سکتی ہے کہ وہ اگر کسی چیز کو درست سمجھتے ہیں تو لوگوں کی طرف رجوع کریں اور ان کے دل و دماغ کو بدلنے کی کوشش کریں۔ جب آپ جمہوریت کا راستہ بند کر دیتے ہیں تو اس کے بعد تشدد کا دروازہ کھلتا ہے اور پھر لوگ اپنے مقاصد کو حل کرنے کے لیے غلط طریقے اختیار کرتے ہیں۔

دوسری چیز نظام تعلیم ہے۔ نظام تعلیم وہ چیز ہے جس کے ذریعے سے آپ قوم کی تعمیر کرتے ہیں۔ پڑھا لکھا طبقہ ہی اصل میں پوری قوم پر موثر ہوتا ہے۔ پاکستان میں بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں کوئی ایک نظام تعلیم نہیں ہے۔ تین مختلف نظام ہائے تعلیم ہمارے ہاں رائج ہیں، بلکہ اب تو اس سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ مذہبی تعلیم کا الگ نظام ہے، غیر مذہبی تعلیم کا الگ نظام ہے، اردو تعلیم کا الگ نظام ہے، انگریزی تعلیم کا الگ نظام ہے۔ یہ مختلف نظام ہائے تعلیم مختلف طبقات کو جنم دیتے ہیں۔ تعلیمی نظام کی یہی تفریق ہے جس نے پوری قوم کو جزیروں میں بانٹ دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ بارھویں جماعت تک تعلیم ہر حال میں یکساں ہونی چاہیے۔ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں

دینی چاہیے کہ وہ اس کے مقابلے میں کوئی متوازی تعلیمی نظام قائم کرنے کی کوشش کرے۔ بچے پوری قوم کی امانت ہیں۔ان سب کو ایک جیسا نصاب اور ایک جیسا ماحول میسر ہونا چاہیے۔اس کے بعد جب سپیشلائز کرنے کا موقع آئے تو کسی خاص شعبے میں تربیت دینی چاہیے۔اس موقع پر جو چاہے تقسیم کر لی جائے،مگر تعلیم کی ابتدا ایک جگہ سے اور ایک طریق کار کے مطابق ہونی چاہیے۔بارھویں جماعت کے بعد بچے شعور کی عمر کو پہنچ کر یہ فیصلہ کریں کہ ان کو عالم بننا ہے،استاد بننا ہے،انجینئر بننا ہے یا ڈاکٹر بننا ہے۔اس کے بعد جتنے چاہیں پرائیویٹ تعلیمی ادارے بنیں جو خاص دائروں میں تعلیم و تربیت کا بندوبست کریں،مگر اس سے پہلے تعلیم کا ایک ہی نظام ہونا چاہیے۔جب تک آپ ملی طور پر،قومی طور پر ایک نظام تعلیم کا فیصلہ نہیں کر لیتے،اس وقت تک معاشرے میں کشمکش کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔

تیسری چیز مسجد کا ادارہ ہے۔یہ بہت بڑا انسٹیٹیوشن ہے۔ہمارے دین میں جمعے کی نماز خاص طور پر ریاست سے متعلق کی گئی ہے۔اسلامی قانون کے مطابق جمعے کا منبر مسلمان حکمرانوں کے ساتھ خاص ہے۔یہ ان کا کام ہے کہ وہ خطبہ دیں اور نماز کا اہتمام کریں۔اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کا تعلق سوسائٹی کے ساتھ بھی قائم ہو اور خدا کے ساتھ بھی۔ہم نے یہ منبر علما کے سپرد کر رکھا ہے۔اس کے نتیجے میں فرقہ بندی پیدا ہوئی ہے۔اس کے نتیجے میں مذہبی لوگوں کے قلعے وجود میں آئے ہیں۔اس سے مسجدوں کی تفریق کی بنیاد پڑی ہے۔یہی مسجد کا ادارہ ہے اور یہی جمعے کا منبر ہے جو اب تشدد کا ذریعہ بھی بننا شروع ہو گیا ہے اور ہنگامے اور فساد کا ذریعہ بھی۔وہ جگہ جو عبادت گاہ کے طور پر ہمارے لیے بہت مقدس تھی،اسی کو ہم اب سیاست کا اکھاڑا بنانے پر تل جاتے ہیں۔چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اس کو واپس لے کر ریاست کے سپرد کیا جائے۔ارباب اقتدار کو اس بات کی طرف توجہ دلائی جائے کہ جمعے کا یہ منبر اللہ کے پیغمبر نے تمھارے سپرد کیا تھا۔جس طرح تم دوسرے کام کرتے ہو،اسی طرح اس منبر کو بھی سنبھالو تا کہ یہ قومی وحدت کا ذریعہ بنے اور اس کے ذریعے سے ریاست اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے قابل ہو۔

چوتھی چیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام ہے۔اس سے میری مراد یہ ہے کہ حکومت کے زیر اہتمام ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو لوگوں کے اندر سماجی شعور بیدار کریں اور ان کی اخلاقی تربیت کا بندوبست کریں۔یہ وہ کام ہے جو حکومت کی نگرانی میں علما کو سونپا جا سکتا ہے۔اس کے نتیجے میں علما کے لیے ایک ایسا چینل بن جاتا ہے جس میں وہ ریاست کے نظام کا حصہ بن کر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو مذہبی طبقے اور حکمران طبقے میں کشمکش باقی رہے گی۔

ہر حکومت یہ چاہتی ہے کہ سماجی برائیوں کا قلع قمع ہو۔وہ رشوت،بددیانتی،خیانت،دھوکا دہی،ظلم و عدوان اور

دوسری برائیوں کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اس ضمن میں اصلاح و تربیت کا کام اگر علما کے سپرد کر دیا جائے تو اس کے نتیجے میں علما بھی اپنے دینی فرائض کی طرف متوجہ ہوں گے اور ان کے اور حکمرانوں کے مابین کوئی کشمکش بھی باقی نہیں رہے گی۔ جہاں تک جرائم کے معاملے میں کارروائی کا تعلق ہے تو یہ کام تو ہر حال میں پولیس اور عدلیہ کے سپرد ہونا چاہیے، لیکن اس سے پہلے اور بعد میں اصلاح و تربیت کے مختلف کاموں پر علما کو مامور کرنا چاہیے۔

پانچویں چیز انصاف ہے۔ اگر کسی ملک میں انصاف موجود نہیں ہے تو وہاں نہ افراد کے مابین اعتماد قائم ہو سکتا ہے، نہ اداروں کے مابین اور نہ حکومت اور عوام کے مابین۔ ہمارے عدالتی نظام کی پستی ہر شخص پر واضح ہے۔ اول تو یہاں انصاف میسر ہی نہیں ہوتا اور اگر کسی کو ہو جاتا ہے تو اس کے لیے عمریں درکار ہوتی ہیں۔ اس نظام کے ساتھ لوگوں کی جتنی شکایتیں وابستہ ہو چکی ہیں، اس کے بعد اگر اس کی اصلاح نہیں کی جاتی تو لوگوں کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ کسی ملک میں اگر انصاف کا صحیح نظام قائم ہو جائے تو اس کے بعد جھگڑے ختم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ وہ پانچ چیزیں ہیں جنھیں میرے نزدیک سول سوسائٹی کا موضوع بننا چاہیے۔ اہل دانش کو ان پر اتفاق رائے قائم کرنا چاہیے اور ہر طبقے کو اس کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اگر ہم ان چیزوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ملکی و قومی کشمکش کے خاتمے کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۲۳)

(گزشتہ سے پیوستہ)

لٰکِنِ اللّٰہُ یَشۡہَدُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکَ، اَنۡزَلَہٗ بِعِلۡمِہٖ، وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ یَشۡہَدُوۡنَ
وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ قَدۡ

(یہ جھٹلاتے ہیں تو جھٹلائیں)، مگر اللہ اُس چیز کی گواہی دیتا ہے جو اُس نے تم پر نازل کی ہے۔[250] اُس نے اپنے علم کے ساتھ اُسے نازل کیا ہے۔ اور اُس کے فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور گواہی کے لیے تو اللہ ہی کافی ہے۔[251] جن لوگوں نے ماننے سے انکار کیا ہے اور اللہ کی راہ سے روکا ہے، وہ بڑی دور کی

[۲۵۰] اِس جملے کی ابتدا حرف استدراک 'لٰکِن' سے ہوئی ہے۔ یہ استدراک اُس بات پر ہے جو اوپر کی آیتوں سے مفہوم ہوتی ہے۔

[۲۵۱] یعنی اِس بات کی گواہی کے لیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اُس نے اِس کو اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے، لہٰذا یہ ہر لحاظ سے خالص اور بے آمیز ہے، اِس میں نفس اور شیطان کے کسی وسوسے کو کوئی دخل نہیں ہے۔

قرآن نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے فرمائی ہے، لیکن یہ وحی کی صداقت کے لیے ایک دلیل بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اوپر وحی کی صداقت کی جو دلیل بیان ہوئی ہے، اُس کی نوعیت تاریخی شہادت کی ہے۔ یعنی انبیا کی تاریخ اور

ضَلُّوۡا ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ﴿١٦٧﴾ اِنَّ الَّـذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَظَلَمُوۡا لَمۡ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغۡفِرَ لَهُمۡ
وَلَا لِيَهۡدِيَهُمۡ طَرِيۡقًا ﴿١٦٨﴾ اِلَّا طَرِيۡقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَآ اَبَدًا، وَكَانَ ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿١٦٩﴾
يٰۤـاَيُّهَا النَّاسُ، قَدۡ جَآءَكُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ، فَاٰمِنُوۡا خَيۡرًا لَّكُمۡ

گمراہی میں جا پڑے ہیں۔ جن لوگوں نے ماننے سے انکار کیا اور (اِس طرح اپنی جانوں پر) ظلم کیا ہے، اللہ اُنھیں بخشنے والا نہیں ہے اور نہ اُنھیں جہنم کے سوا کسی راستے کی ہدایت دینے والا ہے۔ یہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے اور اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے۔ ۱۶۶-۱۶۹

لوگو، تمھارے پاس یہ رسول تمھارے پروردگار کی طرف سے حق لے کر آ گیا ہے[۲۵۲]۔ سو (اِس پر) ایمان لاؤ، اِسی میں تمھاری بہتری ہے۔ اور اگر انکار پر جمے رہو گے تو یاد رکھو کہ (اللہ کا کچھ نہیں بگاڑو

اُن کی وحی کی کسوٹی پر جانچ کر قرآن اور پیغمبر کا درجہ متعین کیا گیا ہے۔ اب یہ ایک دوسری دلیل بیان ہوئی ہے جس کی نوعیت ایک باطنی دلیل کی ہے۔ اِس کا مدعا یہ ہے کہ پیغمبر اپنے باطن میں خدا اور فرشتوں کی شہادت اِس طرح سنتا، سمجھتا اور پرکھتا ہے کہ اُس کے لیے اپنی وحی کی صداقت پر کسی شبہے کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ اِس طرح کی شہادت کسی غیر نبی کو حاصل نہیں ہوتی۔ اِس وجہ سے کسی غیر نبی کے الہام اور نبی کی وحی میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی جس کیفیت کو الہام سمجھ رہا ہے، وہ محض ایک وسوسۂ نفسانی یا شیطانی ہو، لیکن پیغمبر پر وحی جس افق سے آتی ہے، جس زور و قوت کے ساتھ آتی ہے اور اللہ اور ملائکہ کی جس تائید و شہادت کے ساتھ آتی ہے، وہ بجاے خود ایک ایسی برہان ہوتی ہے جس کے بعد کسی شبہے کی گنجایش باقی نہیں رہ جاتی۔ وحی کی صداقت کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے ساری خدائی بھی نبی کی تکذیب کرے، تب بھی اُس کے اعتماد میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اُس کی بزم و انجمن اُس کے باطن کے اندر ہوتی ہے، جہاں اُس کو خدا اور روح القدس کی معیت حاصل ہوتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۳۳)

[۲۵۲] آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن آگے کے مضمون سے واضح ہے کہ روے سخن اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کی طرف ہے۔

وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۷۰﴾ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ، لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ، وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ، اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَاۤ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ، فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا: ثَلٰثَةٌ، اِنْتَهُوْا خَیْرًا لَّكُمْ، اِنَّمَا اللّٰهُ

گے، اِس لیے کہ) زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ (وہ ہر ایک کو اُس کے اعمال کی جزا دے گا، اِس لیے کہ) اللہ علیم و حکیم ہے۔ اے اہل کتاب، اپنے دین میں غلو[۲۵۳] نہ کرو اور اللہ کے حق میں حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔[۲۵۴] حقیقت یہ ہے کہ مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے ایک رسول اور اُس کا ایک قول ہی تھے جو اُس نے مریم کی طرف القا فرمایا تھا اور اُس کی جانب سے ایک روح تھے (جو اللہ نے اُس میں پھونک دی تھی)۔[۲۵۵] سو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور (اللہ کو) تین نہ بناؤ۔[۲۵۶] باز آجاؤ،

---

[۲۵۳] یہ لفظ جب دین کے تعلق سے آتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دین میں جس چیز کا جو درجہ و مرتبہ اور جو وزن اور مقام ہے، اُسے بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ یہاں اِس سے اشارہ اُس غلو کی طرف ہے جس کے سبب سے نصاریٰ نے پورے دین کا حلیہ بگاڑا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے اور اُس کے رسول تھے۔ اُن کو اُنھوں نے خدا کا بیٹا بنایا اور پھر اُن کو لے جا کر خدائی کے عرش پر بٹھا دیا۔ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کی والدہ تھیں، اُن کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنایا۔ حضرت جبریل خدا کے بندے اور فرشتے ہیں، اُن کو بھی ایک اقنوم کی حیثیت دے کر خدائی کی تثلیث میں شریک کر دیا۔ سیدنا مسیح نے دنیا اور دنیوی زندگی کے زخارف سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی تو اُنھوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ غرض اِس غلو کے ہاتھوں اُنھوں نے مذہب کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں چھوڑی جو اپنی جگہ پر برقرار رہ گئی ہو۔ فرش کی چیز عرش پر پہنچ گئی اور عرش کی چیز فرش پر آ رہی۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۳۵)

[۲۵۴] دین میں غلو کا فتنہ اِسی سے پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف اگر وہی بات منسوب کی جائے جو اُس نے کہی ہے تو اِس طرح کا کوئی فتنہ کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

[۲۵۵] یعنی خدا کا کلمۂ 'کن' اور اُس کی طرف سے ایک روح تھے جو اُسی طرح پھونکی گئی، جس طرح آدم و حوا میں پھونکی گئی تھی۔ اس کی بنا پر اُنھیں خدائی کا درجہ آخر کس طرح دیا جا سکتا ہے؟

اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ، سُبۡحٰنَهٗۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗ وَلَدٌ، لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ، وَكَـفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۱۷۱﴾ لَـنۡ يَّسۡتَـنۡكِفَ الۡمَسِيۡحُ اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَلَا الۡـمَلٰٓئِكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ، وَمَنۡ يَّسۡتَنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَيَسۡتَكۡبِرۡ فَسَيَحۡشُرُهُمۡ اِلَيۡهِ جَـمِيۡعًا ﴿۱۷۲﴾ فَـاَمَّـا الَّـذِيۡـنَ اٰمَـنُـوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَيَـزِيۡـدُهُـمۡ مِّـنۡ فَضۡلِهٖ، وَاَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡتَنۡكَفُوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا فَيُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا، وَّلَا يَجِدُوۡنَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا ﴿۱۷۳﴾

یہی تمھارے حق میں بہتر ہے۔ اللہ ہی تنہا معبود ہے، وہ اِس سے پاک ہے کہ اُس کے اولاد ہو، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے اور اُن کے معاملات کو دیکھنے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔[۲۵۷] مسیح کو ہرگز اِس بات سے کوئی عار نہ ہوگی کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو اور نہ اللہ کے مقرب فرشتے اِسے کبھی عار سمجھیں گے۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا اور تکبر کرتا ہے تو عنقریب وہ سب کو گھیر کر اپنے حضور میں اکٹھا کر لے گا۔ پھر جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے ہیں، اُنھیں وہ پورا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے زیادہ بھی عطا فرمائے گا۔ اور جن لوگوں نے اُس کی بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے، اُنھیں وہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے مقابل میں وہ اپنے لیے کوئی حمایتی اور کوئی مددگار نہ پائیں گے۔[۲۵۸] ۱۷۰-۱۷۳

---

[۲۵۶] اس سے مراد نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث ہے۔ یہ پال (Paul) کی اختراعات میں سے ہے اور اِس کی رو سے باپ، بیٹا اور روح القدس تینوں الوہیت میں شریک ہیں۔ تاہم اِس کی تعبیر اِس طریقے سے کی گئی ہے کہ توحید پر ایمان کا دعویٰ بھی برقرار رہے۔

[۲۵۷] یعنی جب خلق اور خلق کے تمام معاملات کو دیکھنے کے لیے اللہ ہی کافی و وافی ہے تو کسی کو خدائی میں شریک کرنے کی گنجایش کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟

[۲۵۸] اِس کا صحیح زور سمجھنے کے لیے 'لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ' کی آیت نگاہ میں رہنی چاہیے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

يَـآيُّهَـا الـنَّـاسُ، قَـدْ جَـآءَ كُـمْ بُـرْهَـانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ، وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا﴿۱۷۵﴾

لوگو، تمھارے پاس اللہ کی حجت آ گئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایک ایسی روشنی نازل کر دی ہے جو (ہر چیز کو) واضح کر دینے والی ہے[۲۵۹]۔ اِس لیے جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اُنھوں نے اُسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا ہے، اُنھیں وہ اپنی رحمت اور اپنی عنایتوں کے (سایے میں) داخل کرے گا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ دکھا دے گا[۲۶۰]۔ ۱۷۴-۱۷۵

”...غلو کے فتنے میں مبتلا ہونے کا بڑا سبب درحقیقت استکبار ہے۔ جو لوگ کسی چیز یا کسی شخص کو مان لیتے ہیں، وہ اگر حدود سے واقف یا اُن کو ملحوظ رکھنے والے نہ ہوں تو اُن کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُس چیز یا شخص کو سب چیزوں اور تمام اشخاص سے بڑھ کر ثابت کر دکھائیں۔ پھر وہ اپنے استکبار کے اعتبار سے اُس کو بڑھانا شروع کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ اُس کو بڑھاتے بڑھاتے اُس حد تک پہنچا دیتے ہیں جہاں پہنچ کر اُن کے استکبار کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اب برتری کے میدان میں کوئی اُن کا حریف نہیں رہا اور یہاں کوئی اُن کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ عیسائیوں کو یہی فتنہ پیش آیا۔ اُنھوں نے جب حضرت عیسیٰ کو مانا تو صرف اتنے ہی پر قانع نہ رہ سکے کہ اُن کو اللہ کا بندہ اور اُس کا رسول مانیں۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ اللہ کے بندے اور رسول تو بہت سے ہیں، اگر مسیح بھی اللہ کے بندے اور رسول ہی ہیں تو پھر اُن کا اور اُن کے ماننے والوں کا امتیاز کیا ہوا؟ اِس محرک نے، جو کھلا ہوا استکبار ہے، اُنھیں آمادہ کیا کہ وہ کھینچ تان کر اُن کو شریک خدا ثابت کریں۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۴۳۷)

[۲۵۹] اِس سے مراد قرآن مجید ہے جس کے لیے اصل میں 'بُرْهَانٌ' اور 'نُوْرًا مُّبِيْنًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ پہلے لفظ سے قرآن کے عقلی اور استدلالی پہلو کو واضح فرمایا ہے کہ وہ ایک برہان قاطع ہے اور دوسرے سے اُس کے عملی پہلو کو کہ زندگی کے تمام معاملات میں وہ انسان کو ایسی رہنمائی عطا فرماتا ہے جو اُسے تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آتی ہے۔

[۲۶۰] یعنی قیامت میں اپنے قرب کی طرف رہنمائی فرمائے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ بات کہ اِس ہدایت کا تعلق آخرت سے ہے، اِس سے نکلتی ہے کہ اس کا عطف 'فَسَيُدْخِلُهُمْ' پر ہے جس

يَسۡتَفۡتُوۡنَكَ، قُلِ: اللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِى الۡكَلٰلَةِ، اِنِ امۡرُؤٌا هَلَكَ لَيۡسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ

وہ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ (اِن سے) کہو: اللہ تمھیں کلالہ رشتہ داروں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے:[۲۶۱] اگر کوئی شخص بے اولاد مرے[۲۶۲] اور اُس کی ایک بہن ہی ہو تو اُس کے لیے ترکے کا آدھا ہے اور اگر

کا تعلق صریحاً آخرت سے ہے اور یہ بات کہ یہ ہدایت مطلوب ومقصود کی طرف ہے، 'اِلَيۡهِ' کے لفظ سے نکلتی ہے۔ یعنی جو لوگ اللہ پر ایمان اور اُس حبل اللہ کو، جو قرآن کی شکل میں اُن کی طرف نازل ہوئی ہے، مضبوطی سے پکڑ لیں گے، خدا اُن کو اپنی رحمت اور فضل بے پایاں سے بھی نوازے گا اور براہ مستقیم اور براہ راست اُن کی رہنمائی اپنے قرب کی طرف بھی فرمائے گا اور یہ آخرت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اِس لیے کہ تمام ہدایت وشریعت کی اصل غایت اور اہل ایمان کی تمام مساعی کا اصل مقصود ومطلوب یہی قربِ الٰہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۳۸)

[۲۶۱] لفظ 'کلالۃ' کی تحقیق اِس سے پہلے اِسی سورہ کی آیات ۱۱-۱۲ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ یہ اب چوتھے اور آخری سوال کا جواب ہے جو اولاد کی عدم موجودگی میں بھائی بہنوں کی میراث کے بارے میں پیدا ہوا ہے۔ اِس کا اشارہ اگرچہ آیات ۱۱-۱۲ میں بھی موجود تھا، لیکن جب لوگ نہیں سمجھے اور اُنھوں نے سوال کیا تو قرآن نے اُس کو پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ آیت کی ابتدا 'قُلِ: اللّٰهُ يُفۡتِيۡكُمۡ فِى الۡكَلٰلَةِ' کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو وہی اسلوب ہے جو 'يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ' میں ہے، وہاں وصیت میت کی وارث اولاد کے بارے میں ہے اور یہاں فتویٰ میت کے وارث کلالہ رشتہ داروں کے بارے میں ہے۔ لفظ 'کلالۃ' پر الف لام دلیل ہے کہ سوال کلالہ وارثوں میں سے کچھ مخصوص اقربا سے متعلق ہے اور جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقربا میت کے بھائی بہن ہیں۔ تمام کلالہ رشتہ داروں، مثلاً چچا ماموں، بھائی بہن، خالہ پھوپھی میں سے کسی کو وارث بنا دینے کی اجازت آیات میراث میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ یہ چیز ملحوظ رہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا: کہہ دو اللہ تمھیں کلالہ رشتہ داروں میں سے بھائی بہنوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔

[۲۶۲] اصل میں 'اِنِ امۡرُؤٌا هَلَكَ لَيۡسَ لَهٗ وَلَدٌ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ بھائی بہنوں کے میراث پانے کے لیے اُسی طریقے پر شرط ہے، جس طرح 'فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ' میں ہے۔ وہاں معنی یہ ہیں کہ میت بے اولاد ہو اور ماں باپ ہی وارث ہوں تو اُن کا حصہ یہ ہے اور یہاں مفہوم یہ ہے کہ مرنے والے کے اولاد نہ ہو اور اُس کے بھائی بہن ہوں تو اُن کا حصہ اِس طرح ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ بھائی بہن صرف اولاد کی

اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ، وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ، فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ، وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ، يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ﴿۱۷۶﴾

بہن بے اولاد مرے تو اُس کا وارث اُس کا بھائی ہے۔ اور بہنیں اگر دو ہوں تو اُس کے ترکے میں سے دو تہائی پائیں گی اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔[۲۶۳] اللہ تمھارے لیے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ۱۷۶

غیر موجودگی میں وارث ہوتے ہیں۔ اولاد موجود ہو تو میت کے ترکے میں اُن کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، الاّ یہ کہ مرنے والا آیت ۱۲ میں کلالہ کے حکم عام کے تحت اُن میں کسی کو بچے ہوئے ترکے کا وارث بنا دے۔

[۲۶۳] بھائی بہنوں کے جو حصے یہاں بیان ہوئے ہیں، اُن میں اور اولاد کے حصوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آیت میں 'وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ' کا اسلوب دلیل ہے کہ یہ حصے بھی والدین اور بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکے میں سے دیے جائیں گے۔ اِس کے دلائل آیت ۱۱ کی تفسیر میں بیان ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ترکے کا جو حصہ بھائی بہنوں میں تقسیم کیا جائے گا، میت کی صرف بہنیں ہی ہوں تو اُنھیں بھی اُسی کا دو تہائی اور اُسی کا نصف ادا ہو گا۔

—— جاوید

جمعرات، ۱۱؍ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

۲۰؍ مارچ ۲۰۰۸ء

ساجد حمید

مچھلی اور ٹڈی کا تذکیہ

عَنْ مَکْحُوْلٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اَلْجَرَادُ وَالنُّوْنُ ذَکِیٌّ کُلُّہُ فَکُلُوْہُ[1]. (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۹۷۴۰)

مکحول سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ٹڈی اور مچھلی ہر قسم کی ذبح شدہ ہے، لہٰذا اسے کھا سکتے ہو[1]۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ یہ بات پچھلی بہت سی روایتوں میں واضح ہو چکی ہے کہ یہ دونوں قسم کے جانور 'میتۃ' کے معنی میں شامل نہیں ہیں اور جن جانوروں میں بہتا خون نہیں ہوتا، ان میں ذبح کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ٹڈی اور مچھلی اسی کی مثالیں ہیں، یہ جب پکڑ لی جائیں تو ذبح سمجھی جائیں۔

متن کے حواشی

۱۔ یہ دراصل ایک اثر ہے، لیکن ''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں ایک حدیث کی حیثیت سے بیان ہوا ہے۔ اثر کی

حیثیت سے، یہ سیدنا عمر، سیدنا علی رضی اللہ عنہما سے ''سنن البیہقی'' میں بھی آیا ہے۔ (سنن البیہقی، رقم ۱۸۷۵۵، ۱۸۷۵۶)

محمد عمار خان ناصر

شرعی سزاؤں کی ابدیت و آفاقیت

[یہ مصنف کی زیر طبع کتاب ''حدود و تعزیرات ـــــ چند اہم مباحث'' کا ایک جز ہے۔ قارئین ''اشراق'' کے افادے کے لیے اس کتاب کے جملہ مباحث کو بالاقساط شائع کیا جا رہا ہے۔]

شرعی قوانین اور بالخصوص سزاؤں سے متعلق شرعی احکام کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے معاصر مسلم فکر جن چند در چند فکری اور عملی سوالات سے نبرد آزما ہے، ان میں سے اہم ترین اور بنیادی بحث یہ ہے کہ قرآن و سنت میں مختلف معاشرتی جرائم مثلاً قتل، زنا، چوری، قذف اور محاربہ[1] وغیرہ سے متعلق جو متعین سزائیں بیان کی گئی ہیں، آیا وہ ابدی

---

[1] شریعت نے معاشرتی جرائم پر جو متعین سزائیں مقرر کی ہیں، فقہا کی اصطلاح میں انھیں 'حدود'، جبکہ ان کے علاوہ ایسی سزاؤں کو جن کی تعیین مسلمانوں کے اولوالامر کی صواب دید پر چھوڑ دی گئی ہے، تعزیر کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں جمہور فقہا قتل، زنا، چوری، قذف اور محاربہ کے علاوہ ارتداد اور شراب نوشی کی سزاؤں کو بھی شرعاً متعین اور ابدی قرار دیتے ہیں۔ ہم نے موخر الذکر یعنی ارتداد اور شراب نوشی کو یہاں اس فہرست میں شمار نہیں کیا، ان میں سے ارتداد کی سزا پر ہم نے ایک مستقل باب میں بحث کی ہے، جبکہ شراب نوشی کے بارے میں ہمیں اہل علم کے اس گروہ کی رائے زیادہ وزنی دکھائی دیتی ہے جو اس کی سزا کے 'حد' یعنی از روے شریعت طے شدہ سزا ہونے سے اختلاف رکھتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی نافذ کردہ سزاؤں کو تعزیر قرار دیتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اولوالامر اس معاملے میں کسی مخصوص سزا کے نفاذ کے پابند نہیں ہیں۔ (ابن حزم، المحلّٰی ۱۳/ ۱۹۸۔ ابن حجر، فتح الباری ۱۲/ ۷۰۔ ۷۵۔ محمد بن سعد الغامدی، عقوبۃ الاعدام ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ سید سلیمان ندوی، حاشیہ ''علم الکلام اور الکلام'' از شبلی نعمانی ۲۳۸۔ ایضاً، ''کیا اسلام میں تجدید کی ضرورت ہے؟''، مشمولہ ''اسلامی تہذیب و ثقافت''،

اورآفاقی نوعیت کی ہیں یا ان کی معنویت اور افادیت ایک مخصوص زمان ومکان تک محدود تھی۔ ایک مکتب فکر یہ رائے رکھتا ہے کہ یہ سزائیں تجویز کرتے وقت اہل عرب کے مخصوص تمدنی مزاج اور معاشرتی عادات واطوار کو پیش نظر رکھا گیا تھا اور اس معاشرت میں جرائم کی روک تھام کے حوالے سے یہ موزوں اور موثر تھیں، تاہم ان کی ظاہری صورت کو ہر دور میں بعینہٖ برقرار رکھنا ضروری نہیں اور اصل مقصد، یعنی عدل وانصاف پر مبنی معاشرے کے قیام اور جرائم کی روک تھام کو سامنے رکھتے ہوئے کسی بھی معاشرے کی نفسیات اور تمدنی حالات وضروریات کے لحاظ سے قرآن کی بیان کردہ سزاؤں سے مختلف سزائیں تجویز کی جاسکتی ہیں۔

یہاں تنقیح طلب نکتہ یہ ہے کہ آیا شارع نے کیا فی الواقع ان سزاؤں کی اساس یہی بیان کی ہے کہ ان کے ذریعے سے محض معاشرے میں جان ومال اور آبرو وغیرہ کا تحفظ مقصود ہے اور یہ کہ سزا کے اصل مقصد کو ملحوظ رکھتے

۱/ ۱۰۴، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ؛ عمر احمد عثمانی، فقہ القرآن: حدود وتعزیرات اور قصاص ۵۵۹۔ ۵۶۸؛ جاوید احمد غامدی، برہان ۱۳۸۔ ۱۳۹)

اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود شراب نوشی کی کوئی مخصوص سزا مقرر نہیں فرمائی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو شخص اس جرم میں پکڑ کر آپ کی عدالت میں لایا جاتا، آپ کے حکم پر گھونسوں، جوتوں اور چھڑیوں کے ساتھ اس کی پٹائی کی جاتی تھی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں اس کی کوئی باقاعدہ سزا مقرر کر دینی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے اندازہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شرابی کو تقریباً کتنی ضربیں لگائی جاتی تھیں اور اس کی روشنی میں چالیس کوڑوں کی سزا مقرر کر دی۔ پھر سیدنا عمر نے اپنے دور میں صحابہ سے مشاورت کی تو سیدنا علی نے یہ رائے دی کہ شراب نوشی کا مجرم ہوش کھونے کے بعد ہذیان بکتا ہے اور کسی پر بے بنیاد تہمت بھی لگا سکتا ہے، جبکہ تہمت لگانے کی سزا ۸۰ کوڑے ہے، اس لیے شرابی کو یہی سزا دی جانی چاہیے۔ (نسائی، السنن الکبریٰ، رقم ۵۲۸۸)

اس سے واضح ہے کہ شراب نوشی پر کوئی مخصوص سزا مقرر کرنے کے حق میں صحابہ کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واضح حکم یا آپ کی قائم کردہ کوئی سنت نہیں تھی اور انھوں نے قیاسی استدلال کی بنیاد پر ۴۰ یا ۸۰ کوڑوں کی سزا مقرر کی تھی۔ سیدنا علی اسی بنیاد پر فرماتے تھے کہ اگر کوئی مجرم حد نافذ کرنے کے نتیجے میں مر جائے تو اس کی کوئی دیت نہیں، لیکن اگر کوئی شخص شراب نوشی کے جرم میں کوڑے لگائے جانے پر مر جائے تو اس کی دیت ادا کی جائے گی، کیونکہ اس کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں، بلکہ ہم نے خود مقرر کی ہے۔ (نسائی، السنن الکبریٰ، رقم ۵۲۷۱، ۵۲۷۲)

ہوئے، ان سزاؤں کی ظاہری صورت میں تبدیلی کی گنجایش موجود ہے؟ قرآن مجید کے متعلقہ نصوص کے مطالعے سے اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ اس معاملے میں اس کا زاویۂ نگاہ جوہری طور پر زیر بحث زاویۂ نگاہ سے مختلف ہے۔ قرآن ان سزاؤں کو اصلاً 'حقوق العباد'، یعنی جان و مال اور آبرو کے تحفظ کے ایک ذریعے کے طور پر بیان نہیں کرتا اور نہ اس نے ان سزاؤں کو بیان کرتے ہوئے وہ مقدمہ ہی قائم کیا ہے جو زیر بحث نقطۂ نظر میں ان سزاؤں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ انسانی معاشرے میں امن ہونا چاہیے، اور چونکہ مذکورہ جرائم امن وامان کو تباہ کر دیتے ہیں، اس لیے یہ معاشرے کے تحفظ کا تقاضا ہے کہ ان جرائم کی روک تھام کے لیے مجرموں کو مذکورہ سزائیں دی جائیں۔ قرآن نے یہ بات نہیں کہی، بلکہ وہ ان سزاؤں کو 'حق اللہ' کے طور پر بیان کرتا ہے اور اس کا مقدمہ یہ ہے کہ انسان کی جان، مال اور اس کی آبرو کو اللہ نے حرمت بخشی ہے اور اللہ کی اجازت کے بغیر یہ حرمت کسی صورت میں ختم نہیں کی جا سکتی، اس لیے اگر کوئی مجرم کسی انسان کی جان، مال یا آبرو پر تعدی کرتا ہے تو وہ دراصل خدا کی قائم کی ہوئی ایک حرمت کو پامال کرتا ہے اور اس طرح خدا کی طرف سے سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی جرم پر خدا کی بیان کردہ سزا دراصل خدا کا حق ہے، جس کے نفاذ کو اس نے انسانوں کی ذمہ داری ٹھہرایا ہے۔

شرعی سزاؤں کا یہ پہلو قرآن مجید نے کم وبیش ہر موقع پر واضح کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱۷۸ میں اللہ تعالیٰ نے قاتل سے قصاص لینے کو فرض قرار دیا ہے۔ قصاص کا قانون تورات میں بھی بیان کیا گیا تھا، تاہم اس میں قاتل کو معاف کر کے دیت لینے کی گنجایش نہیں رکھی گئی تھی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ اجازت تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قتل کی صورت میں قاتل کو قتل کرنا یا اس سے دیت لے کر معاف کر دینا انسانوں کی صواب دید پر مبنی نہیں، بلکہ یہ اجازت خدا کی طرف سے رحمت کی وجہ سے ملی ہے اور اگر وہ تورات کے قانون کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی اجازت نہ دیتا تو قاتل کو قصاص میں قتل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا۔

سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۲ میں زانی مرد اور زانی عورت کے لیے سو کوڑوں کی سزا بیان کی گئی ہے۔ یہاں قرآن نے اپنی بیان کردہ سزا کے نفاذ کو اللہ کے دین پر عمل درآمد کا معاملہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ مجرم پر کوئی ترس کھائے بغیر اس پر سزا کا نفاذ اہل ایمان کے ایمان کا تقاضا ہے۔

سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۳۸ میں چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا

ہے اور اس سزا کو ُنَـکَالًا مِّنَ اللّٰہِ'، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرت کا نمونہ کہا گیا ہے۔ اس سے پہلے آیت ۳۳- ۳۴ میں محاربہ اور فساد فی الارض کے مجرموں کی سزائیں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ مجرم قانون کی گرفت میں آنے سے پہلے توبہ کر لیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا، مہربان ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ توبہ کی صورت میں اللہ کی طرف سے معافی کی پوری توقع ہے، اس لیے ایسے مجرموں پر سزا نافذ نہ کی جائے۔

ان سزاؤں کا یہ پہلو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات سے بھی واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص قتل، زنا، چوری اور بہتان طرازی کا مرتکب ہو اور دنیا ہی میں اپنے کیے کی سزا پا لے، اس کی سزا اس کے گناہ کا کفارہ بن جائے گی، لیکن اگر دنیا میں وہ سزا سے بچ گیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا حق ہوگا کہ وہ چاہے تو اسے سزا دے اور چاہے تو معاف کر دے۔ (بخاری، رقم ۱۷) ایک دوسری روایت میں آپ نے اس بات کو یوں بیان کیا کہ اگر کسی شخص کو دنیا ہی میں اس کے جرم کی سزا مل جائے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کے عدل سے بعید ہے کہ وہ آخرت میں اسے دوبارہ اس کی سزا دے۔ (ترمذی، رقم ۲۵۵۰) دونوں روایتوں سے واضح ہے کہ دنیا میں ملنے والی سزا بھی دراصل اللہ کا حق ہے، جس کا نفاذ مجرم کو آخرت کے عذاب سے بچا لیتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً بھی بہت سے مقدمات میں مجرم کے ساتھ ہمدردی محسوس کرنے، صاحب حق کے معاف کر دینے یا تلافی کی متبادل صورت موجود ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سزا ہی کے نفاذ پر اصرار کیا۔ چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اسلام میں سب سے پہلے جس شخص کا ہاتھ کاٹا گیا، اسے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا اور آپ کو بتایا گیا کہ اس نے چوری کی ہے تو آپ کا چہرہ مبارک اس طرح سیاہ ہو گیا، جیسے اس پر راکھ پھینک دی گئی ہو۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ، آپ کو کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا: ''میں اس پر سزا نافذ کرنے سے کیسے رک سکتا ہوں، جبکہ تم خود اپنے بھائی کے خلاف شیطان کی مدد کرنے والے ہو؟ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں اور معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ (تمھیں چاہیے تھا کہ اس کو میرے سامنے پیش نہ کرتے، کیونکہ) حکمران کے سامنے جب سزا سے متعلق کوئی معاملہ پیش ہو جائے تو اس کے لیے سزا کو نافذ کرنا ہی مناسب ہے۔'' (مسند احمد، رقم ۳۷۸۰)

ایک شخص نے صفوان بن امیہ کی چادر چرا لی۔ اس کو پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ صفوان نے چور پر ترس کھاتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ، میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، اس لیے میں اپنی چادر اس چور کو ہبہ کرتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے میرے

پاس لانے سے قبل اسے کیوں معاف نہیں کر دیا؟ چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ (نسائی، رقم ۴۷۹۵؛ ابن ماجہ، رقم ۲۵۸۵)

عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نے چوری کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اس کی قوم کے لوگوں نے کہا کہ ہم اس کا عوض مال کی صورت میں دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ انھوں نے کہا کہ ہم پانچ سو دینار تک دینے کے لیے تیار ہیں، لیکن آپ نے فرمایا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ (مسند احمد، رقم ۶۳۷۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر حدود کے معاملے میں سفارش کو سخت ناپسند کیا اور اس پر ناراضی کا اظہار کیا۔ آپ کے سامنے بنومخزوم کی ایک خاتون فاطمہ کو چوری کے مقدمے میں پیش کیا گیا اور آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ سنا دیا تو اس کے قبیلے کے لوگوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور انھوں نے اسامہ بن زید کو اس کے حق میں سفارش کے لیے آمادہ کیا۔ اسامہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں سفارش پیش کی تو آپ نے فرمایا: 'اَتَشْفَعُ فِیْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ؟' (کیا تم اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کر رہے ہو؟) اس موقع پر آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا کہ تم سے پہلے لوگ بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں کوئی عزت دار شخص چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی کم مرتبہ شخص چوری کا مرتکب ہوتا تو اس پر سزا نافذ کر دیتے۔ آپ نے فرمایا کہ بخدا، اگر فاطمہ بنت محمد نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ (بخاری، رقم ۳۲۱۶) آپ نے فرمایا کہ جس شخص کی سفارش اللہ کی مقرر کردہ سزاؤں میں سے کسی سزا کے نفاذ میں حائل ہوئی، اس نے گویا اللہ کا مقابلہ کرنے کی روش اختیار کی۔ (ابوداؤد، رقم ۳۱۲۳) آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جن لوگوں کا عمومی چال چلن اچھا ہو، ان سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس سے درگذر کیا کرو، لیکن 'حدود' کے معاملے میں ایسا نہ کرو۔ (ابوداؤد، رقم ۳۸۰۳)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ قرآن وسنت ان سزاؤں کو اصلاً، ایک سماجی ضرورت کے طور پر نہیں، بلکہ خدا کے حق کے طور پر بیان کرتے ہیں، جس میں خود اس کے حکم کے بغیر کسی تبدیلی کی علمی وعقلی طور پر کوئی گنجایش نہیں۔ جہاں تک جرائم کے سدباب کا تعلق ہے تو یقیناً وہ بھی ان سزاؤں کا ایک اہم پہلو ہے، لیکن اس کی حیثیت اضافی اور ثانوی ہے اور اسے بنیاد بنا کر سزا کی اصل اساس کو اس کے تابع بنا دینے، بلکہ بالکل نظر انداز کر دینے کو کسی طرح بھی شارع کے منشا کی ترجمانی نہیں کہا جا سکتا۔ شرعی سزاؤں کو یہی حیثیت سابقہ شرائع میں بھی حاصل رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ

جب یہود نے تورات میں بیان ہونے والی بعض سزاؤں کو سنگین تصور کرتے ہوئے نرم سزا کی توقع پر بعض مقدمات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا تو قرآن نے ان کے اس طرز عمل پر تنقید کی اور فرمایا کہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے، پھر یہ اس کو چھوڑ کر آپ کو کیسے حکم بنا سکتے ہیں؟ (مائدہ ۵: ۴۳)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقدمے میں یہود کے منشا کو بالکل الٹتے ہوئے، مجرموں پر تورات ہی کی سزا نافذ فرمائی اور پھر فرمایا: 'اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَوَّلُ مَنْ اَحْیَا اَمْرَکَ اِذْ اَمَاتُوْہُ' (یا اللہ، میں پہلا وہ شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا، جبکہ انھوں نے اسے مردہ کر رکھا تھا)۔ (مسلم، رقم ۳۲۱۲)

نصوص کی روشنی میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان استدلالات پر بھی تبصرہ کر دیا جائے جو اس ضمن میں بالعموم پیش کیے جاتے ہیں:

سیدنا عمر کا فیصلہ

پہلا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ سیدنا عمر نے اپنے عہد حکومت میں قحط سالی کے زمانے میں چور کے لیے قطع ید کی سزا پر عمل درآمد روک دیا تھا جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس سزا کے نفاذ کو ہر حالت میں ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم یہ نکتہ اصل بحث سے بالکل غیر متعلق ہے، اس لیے کہ کسی حکم کا اصولی طور پر واجب الاتباع نہ ہونا ایک چیز ہے اور کسی مخصوص صورت حال میں اس کے اطلاق میں کسی اخلاقی اور شرعی مصلحت کو ملحوظ رکھنا ایک بالکل دوسری چیز۔ سیدنا عمر کا مذکورہ فیصلہ دوسرے دائرے کی چیز ہے اور اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ قرآن مجید نے حکم کے اطلاق کا یہ اصول خود واضح کیا ہے کہ ایک حکم کی تخصیص دین ہی کے کسی دوسرے حکم یا شرعی و اخلاقی اصول کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جو مسلمان غیر مسلموں کے علاقے میں ان کے ظلم و جبر کا شکار ہوں، ان کی مدد کو مسلمانوں کا فرض قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کا صلح کا معاہدہ ہو تو پھر اس قوم کے خلاف مظلوم مسلمانوں کی مدد نہیں کی جا سکتی۔ (الانفال ۸: ۷۲) اسی طرح جب مشرکین عرب کو ایمان نہ لانے کی صورت میں قتل کرنے کا حکم دیا گیا تو یہ واضح کیا گیا کہ جن مشرک قبائل کے ساتھ مخصوص مدت تک صلح کے معاہدے کیے گئے ہیں، ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا جا سکتا۔ (التوبہ ۹: ۴) اس اصول کی روشنی میں دیکھیے تو شریعت میں مختلف معاشرتی جرائم پر جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، ان کے نفاذ میں ان تمام شروط و قیود اور مصالح کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو جرم و سزا کے باب میں عقل عام پر مبنی اخلاقیات قانون اور خود شریعت کی ہدایات سے ثابت ہیں اور جس کے بعض اہم پہلو ہم اسی کتاب

میں ''سزا کے نفاذ اور اطلاق کے اصول'' کے زیرعنوان واضح کریں گے۔ جرم کی نوعیت و کیفیت اور مجرم کے حالات کی رعایت کرنا اور اگر وہ کسی پہلو سے معاف کیے جانے کا مستحق ہو تو اسے معاف کر دینا انھی اصولوں میں سے ایک بنیادی اصول ہے۔ کسی بھی مجرم پر سزا کا نفاذ اسی صورت میں قرین انصاف ہے جب مجرم کسی بھی پہلو سے رعایت کا مستحق نہ ہو۔ اگر جرم کی نوعیت و کیفیت اور مجرم کے حالات کسی رعایت کا تقاضا کر رہے ہوں تو اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے سزا کو نافذ کرنا عدل وانصاف اور خود شارع کے منشا کے خلاف ہے اور سیدنا عمر نے اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے قحط سالی کے زمانے میں قطع ید کی سزا پر عمل درآمد کو روک دیا تھا۔ ان کے اس فیصلے سے کسی طرح یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ فی نفسہٖ ان سزاؤں کو ہی شریعت کا کوئی ابدی حکم تصور نہیں کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ کا نقطۂ نظر

دوسرا استدلال برصغیر کے جلیل القدر عالم شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے حوالے سے پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب ''علم الکلام اور الکلام'' میں شاہ صاحب کی تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' سے ایک اقتباس نقل کر کے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شاہ صاحب قتل، زنا اور چوری وغیرہ سے متعلق قرآن کی بیان کردہ سزاؤں کو اہل عرب کی عادات پر مبنی اور ان کی مخصوص معاشرت ہی کے لیے موزوں سمجھتے ہیں، جبکہ دنیا کے دیگر معاشروں میں ان سزاؤں کے نفاذ کو لازم قرار نہیں دیتے۔ یہ عبارت ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے 'المبحث السادس' کے 'باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان' سے لی گئی ہے۔ ذیل میں ہم سیاق وسباق کی روشنی میں، اس کا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

مذکورہ باب میں شاہ صاحب نے جو بحث اٹھائی ہے، اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دنیا میں مختلف اقوام اور ملل کے وجود میں آ جانے اور ان کے اختیار کردہ سنن وشرائع میں راہ راست سے کجی اور انحراف واقع ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ایک ایسا امام راشد سامنے آئے جو تمام ملتوں کو ایک ملت پر جمع کر دے اور ان ملتوں میں پائے جانے والے انحراف کو درست کرنے کے لیے وہی کردار ادا کرے جو ایک خلیفہ راشد دوسرے ظالم حکمرانوں کے ظلم وجور کو ختم کر کے دنیا میں عدل قائم کرنے کے لیے ادا کرتا ہے۔ اس عالم گیر مقصد کے حصول کے لیے امام راشد کو ان عمومی اصولوں کے علاوہ جن کی وضاحت شاہ صاحب نے 'باب الارتفاق الرابع' میں کی ہے، چند مزید اصولوں کی بھی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب نے اس ضمن میں حسب ذیل اصولوں کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔ یہ امام راشد ایک مخصوص قوم کو تزکیہ وتربیت کے بعد اپنا آلہ وجارحہ بنائے اور پھر وہ قوم دنیا کی دیگر ملتوں کو

اس امام کی لائی ہوئی ملت پر جمع کرنے کی ذمہ داری انجام دے۔

۲۔ یہ قوم صاحب ملت کی مقرر کردہ ملت کے لیے دینی حمیت کے ساتھ ساتھ نسبی حمیت بھی رکھتی ہو۔

۳۔ صاحب ملت اس مقصد کے لیے اپنے دین کو دنیا کے دوسرے سارے ادیان پر غالب کر دے جس کی صورت یہ ہو کہ اس دین کے شعائر کا عام چرچا کیا جائے، جبکہ دیگر ادیان کے شعائر کے عمومی اظہار کو ممنوع قرار دیا جائے۔ اسی طرح غیر مسلموں کو قانونی اور معاشرتی امور میں مسلمانوں کے ہم پلہ نہ سمجھا جائے، بلکہ انھیں پستی اور کہتری کا احساس دلا کر اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

۴۔ صاحب ملت لوگوں کو شریعت کے ظاہری احکام کا پابند بنائے اور ان احکام کے اسرار و مصالح کے ساتھ انھیں زیادہ مشغول نہ ہونے دے، کیونکہ اسرار و مصالح پر غور کے نتیجے میں اختلاف پیدا ہوگا اور شریعت دینے سے اللہ تعالیٰ کے پیش نظر جو مقصد ہے، وہ فوت ہو جائے گا۔

۵۔ اس دین کے بارے میں یہ واضح کر دیا جائے کہ یہی واضح، آسان اور معقول دین ہے اور اس میں مقرر کیے جانے والے طریقے انسانوں کی اکثریت کے لیے زیادہ فائدہ مند ہیں، جبکہ دیگر تمام ادیان تحریف اور انحراف کا شکار ہونے کی وجہ سے قابل اتباع نہیں رہے۔

باب کے اس پورے نظم سے واضح ہے کہ یہاں بنیادی نکتہ یہ زیر بحث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت اور شریعت پر پوری انسانیت کو جمع کرنے کے لیے کون کون سے اصولوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ان اصولوں میں سے پہلے اصول یعنی ایک مخصوص قوم کو تزکیہ و تربیت کے بعد دنیا کی دیگر ملتوں کو امام راشد کی ملت پر جمع کرنے کا ذریعہ بنانے کی توضیح کرتے ہوئے شاہ صاحب نے وہ عبارت لکھی ہے جو شبلی نے نقل کی ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ شرعی سزاؤں کو ابدی اور آفاقی نہیں سمجھتے۔ 'باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان' کا جو بنیادی نکتہ اور رخ اوپر واضح کیا گیا ہے، اس کی روشنی میں اب اس عبارت کو دیکھیے:

منها ان يدعو قوما الى السنة الراشدة ويزكيهم ويصلح شانهم ثم يتخذهم بمنزلة جوارحه فيجاهد اهل الارض ويفرقهم فى الآفاق وهو قوله تعالىٰ كنتم خير امة اخرجت للناس وذلك	''ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دے اور ان کا تزکیہ اور اصلاح کرنے کے بعد انھیں اپنا آلہ و جارحہ بنائے اور انھیں مختلف خطوں کی طرف بھیج کر ان کے ذریعے سے اہل زمین کے ساتھ جہاد کرے۔ اللہ تعالیٰ کے

لان هـذا الامـام نـفسـه لا يتاتى منـه مـجاهدة امم غير محصورة واذا كان كـذلك وجـب ان تكون مادة شريعته مـا هـو بمنزلة المذهب الطبيعي لاهل الاقـاليم الصالحة عربهم وعجمهم ثم مـا عـنـد قـومه من العلم والارتفاقات ويـراعـى فيهم حالهم اكثر من غيرهم ثـم يـحـمـل الـناس جميعا على اتباع تـلك الشـريـعة لانـه لا سبيل الـى ان يـفـوض الامر الى كل قوم او الى ائمة كـل عـصـر اذ لا يـحـصـل منـه فائدة التشـريع اصلا ولا الى ان ينظر ما عند كـل قـوم ويـمارس كلا منهم فيجعل لـكـل شريعة اذ الاحاطة بعاداتهم وما عـندهم على اختلاف بلدانهم وتباين اديـانهـم كالممتنع وقد عجز جمهور الـرواة عـن رواية شـريـعة واحـدة فما ظـنك بشـرائـع مختلفة والاكثر انه لا يـكـون انـقيـاد الآخـرين الا بعد عدد ومـدد لا يـطـول عمر النبى اليها كما وقـع فـى الشـرائع الموجودة الآن فان اليهـود والنصارى والمسلمين ما آمن مـن اوائـلهـم الا جـمـع ثـم اصبـحوا ظاهرين بعد ذلك فلا احسن ولا ايسر مـن ان يـعتبـر فـى الشـعـائر والحدود

ارشاد 'كُنتُم خَيرَ اُمَّةٍ اُخرِجَتْ لِلنَّاسِ' کا یہی مطلب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امام کے لیے بذات خود دنیا کی لاتعداد قوموں کے خلاف جہاد کرنا ممکن نہیں۔ اس صورت حال میں ضروری ہے کہ اس کی شریعت کا مادہ ایک تو وہ (احکام وقوانین) ہوں جو عرب وعجم کی مہذب قوموں کے لیے ایک فطری طریقے کی حیثیت رکھتے ہیں اور پھر وہ علوم وارتفاقات جو امام کی مخاطب قوم کے ہاں پائے جاتے ہیں اور اس شریعت میں اس قوم کے حالات کی دوسروں کی نسبت زیادہ رعایت کی جائے۔ پھر امام راشد دنیا کے تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی پر مجبور کرے، کیونکہ نہ تو یہ ممکن ہے کہ وضع شریعت کا معاملہ ہر قوم یا ہر دور کے ائمہ کے سپرد کر دیا جائے، اس لیے کہ اس سے شریعت مقرر کرنے کا فائدہ ہی سرے سے فوت ہو جاتا ہے، اور نہ یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ امام راشد ہر قوم کے احوال وعادات کو دیکھے اور ان میں سے ہر ایک کے معاملات کا خود تجربہ حاصل کرے اور پھر سب کے لیے الگ الگ شریعت مقرر کرے، کیونکہ خطہ ہائے زمین اور مذاہب کے اختلاف اور تباین کے باعث ان سب قوموں کی عادات اور اطوار کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ راویوں کی اکثریت ایک ہی شریعت کو (بحفاظت) آگے منتقل کرنے سے عاجز ہے تو الگ الگ شریعتوں کے نقل کیے جانے کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے! پھر یہ بھی ہے کہ دوسری قوموں کا امام راشد کے دین کی پیروی اختیار کرنا عام طور پر عرصہ دراز کی کوششوں اور

والارتفاقات عادة قومه المبعوث فيهم ولا يضيق كل التضييق على الآخرين الذين ياتون بعد ويبقى عليهم فى الجملة والاولون يتيسر لهم الاخذ بتلك الشريعة بشهادة قلوبهم وعاداتهم والآخرون يتيسر لهم ذلك بالرغبة فى سير ائمة الملة والخلفاء فانها كالامر الطبيعى لكل قوم فى كل عصر قديما او حديثا.

(حجۃ اللہ البالغہ ۱/۲۴۸)

کاوشوں کے بعد ہی ہوسکتا ہے اور نبی کی عمر اس قدر طویل نہیں ہوتی۔ چنانچہ دنیا کے موجودہ مذاہب میں ایسا ہی ہوا ہے، کیونکہ یہود ونصاریٰ اور مسلمانوں کی ابتدائی نسلوں میں ایک گروہ ہی ایمان لایا تھا جسے بعد میں غلبہ نصیب ہوا۔ اس صورت حال میں اس سے اچھا اور آسان طریقہ کوئی نہیں ہوسکتا کہ امام راشد شعائر، رسوم واحکام اور ارتفاقات میں اس قوم کی عادات کی رعایت کرے جس کی طرف اسے مبعوث کیا گیا ہے، جبکہ بعد میں آنے والوں کے لیے اس معاملے میں بہت زیادہ سختی کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے، بلکہ ان کے لیے امام راشد کی شریعت اصولی حیثیت میں لازم رہے۔ (اولین قوم اور بعد کی اقوام میں فرق یہ ہوگا کہ) پہلوں کے لیے اس شریعت کو اختیار کرنا اپنے دلوں کی شہادت اور اپنی عادات کی موافقت کی بنیاد پر آسان ہوگا، جبکہ بعد میں آنے والوں کے لیے یہ یوں آسان ہوگا کہ وہ اس ملت کے ائمہ اور حکمرانوں کے طریقوں اور عادات کی پیروی میں راغب ہوں، کیونکہ حکمران قوم کے طریقوں کی پیروی کی رغبت پیدا ہونا قدیم اور جدید، ہر دور میں ہر قوم کے لیے ایک فطری طریقہ رہا ہے۔''

مولانا شبلی نے اس اقتباس میں 'فلا احسن ولا ایسر من ان یعتبر فی الشعائر والحدود والارتفاقات عادة قومه المبعوث فيهم ولا يضيق كل التضييق على الآخرين الذين ياتون بعد' سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ ''اس اصول سے یہ ظاہر ہوگیا کہ شریعت اسلامی میں چوری، زنا، قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، ان میں کہاں تک عرب کی رسم ورواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک

ضروری ہے‘‘ (الکلام ۱۲۴)۔ تاہم باب کے پورے نظم اور خود اس جملے کے سیاق وسباق سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بات کسی طرح بھی شاہ صاحب کے مدعا کی ترجمانی نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے مذکورہ اقتباس میں بنیادی طور پر دو سوالات کا جواب دیا ہے:

پہلا یہ کہ تمام ملتوں کو ایک ملت پر جمع کرنے کے لیے امام راشد کو کسی مخصوص قوم کو اپنا آلہ و جارحہ بنانے کی ضرورت کیوں ہے؟

شاہ صاحب نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ تمام ملتوں کو اس ایک ملت پر بالفعل جمع کرنے کی ذمہ داری براہ راست امام راشد پر ڈال دینا مناسب نہیں تھا، کیونکہ امام کے لیے بذات خود دنیا کی بے شمار اقوام کے خلاف جہاد کر کے انھیں مغلوب کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ مناسب یہی تھا کہ وہ ایک مخصوص قوم کو تزکیہ وتربیت کے ذریعے سے اس مقصد کے لیے تیار کرے اور پھر آفاق عالم میں اس ملت کی اشاعت کی ذمہ داری اس قوم کے سپرد کر دی جائے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب نے شرائع اور مناہج کے حوالے سے پیغمبر کی مبعوث الیہ قوم کی عادات اور سنن کو ملحوظ رکھنے کی جو اصولی بحث کی ہے، اس کی روشنی میں اس مخصوص قوم کو دی جانے والی شریعت کی نوعیت کیا ہوگی اور دنیا کی دوسری اقوام اور ملل کو کیونکر اس کا پابند کیا جا سکے گا؟

اس کے جواب میں شاہ صاحب نے تین امکانی طریقے بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ شریعت کا معاملہ ہر قوم یا ہر زمانے کے ائمہ کے سپرد کر دیا جاتا۔ شاہ صاحب نے اس امکان کی صاف نفی کی ہے اور کہا ہے کہ یہ طریقہ، تشریع کے بنیادی مقصد اور فائدے ہی کو فوت کر دینے والا ہوتا، اس لیے یہ ضروری تھا کہ شریعت کے معاملے کو اقوام اور ائمہ کی صواب دید پر چھوڑنے کے بجائے تمام لوگوں کو امام راشد ہی کی دی ہوئی شریعت کا پابند کیا جاتا۔ (ثم یحمل الناس جمیعا علی اتباع تلك الشریعة لانه لا سبیل الی ان یفوض الامر الی کل قوم او الی ائمة کل عصر اذ لا یحصل منه فائدة التشریع اصلا)۔

دوسرا امکان یہ ہو سکتا تھا کہ خود امام راشد دنیا کی ہر ہر قوم کے لیے الگ الگ شریعت مقرر کر دیتا۔ شاہ صاحب نے اس کو بھی ناممکن قرار دیا ہے، اس لیے کہ ایک تو دنیا کے دور دراز علاقوں میں آباد تمام اقوام کی عادات کا احاطہ عملاً محال ہے اور دوسرے ان اقوام کے، دائرۂ ملت میں داخل ہونے کے لیے عادتاً ایک طویل عرصہ چاہیے، جبکہ امام راشد اس قدر طویل عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔

ان دو امکانات کی نفی کرتے ہوئے شاہ صاحب نے تیسرے امکان کو احسن اور ایسر قرار دیا ہے، یعنی یہ کہ امام راشد

کو جو شریعت دی جائے، اس میں ان عادات کو تو ملحوظ رکھا ہی جائے جو عرب وعجم کے تمام صالح مزاج اقالیم کے لیے 'مذہب طبعی' کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن اس مخصوص قوم کے علوم وارتفاقات اور اس کے حالات کی زیادہ رعایت کی جائے، جس کی طرف امام راشد کو مبعوث کیا گیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس مخصوص قوم کی عادات کی رعایت سے مقرر کی جانے والی شریعت کو دنیا کی باقی اقوام کے لیے کیسے مانوس و مالوف بنایا جائے تو شاہ صاحب نے اس کی حکمت عملی یہ بیان کی ہے کہ یہ شریعت اصولی حیثیت میں تو ان کے لیے لازم رہے، لیکن انھیں عملاً اس کا پابند بنانے کے لیے زیادہ سختی اور تنگی سے کام نہ لیا جائے (لا یضیق کل التضییق علی الآخرین الذین یاتون بعد ویبقی علیهم فی الجملة)۔ شاہ صاحب ان اقوام کو شریعت کے ان احکام سے مانوس کرنے کے لیے جو ان کے لیے 'بمنزلہ مذہب طبعی' کے نہیں ہیں، ایک دوسرا طریقہ تجویز کرتے ہیں جو ان کی رائے میں ہر زمانے میں ہر قوم کے لیے فطری طریقے کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی یہ کہ بعد میں آنے والی ان اقوام میں اپنے حکمرانوں (جو پیغمبر کی مبعوث الیہ قوم سے تعلق رکھتے ہیں) کی سیرت اور طور طریقوں کی طرف رغبت پیدا ہو اور وہ ان سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ اس شریعت کو اپنانے کے لیے آمادہ ہو جائیں (والآخرون یتیسر لهم ذلك بالرغبة فی سیر ائمة الملة والخلفاء فانها کالامر الطبیعی لکل قوم فی کل عصر قدیما وحدیثا)۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ شاہ صاحب کا مدعا ہرگز وہ نہیں جو شبلی وغیرہ نے اخذ کیا ہے۔ اول تو اس عبارت میں وہ فقہی اصطلاح کے مطابق خاص حدود کے حوالے سے کوئی بحث نہیں کر رہے، بلکہ عمومی طور پر شرعی احکام کے نفاذ کا فلسفہ اور اس کی حکمت عملی واضح کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے شرعی احکام کے اہل عرب کی عادات پر مبنی ہونے کے نکتے کو انھیں غیر ابدی اور غیر آفاقی قرار دینے کے لیے بنیاد نہیں بنایا، بلکہ ان احکام کو ابدی مان کر انھیں دیگر اقوام پر نافذ کرنے کی حکمت عملی کو موضوع بحث بنایا ہے۔ شاہ صاحب کی بیان کردہ حکمت عملی پر کئی سوال اٹھائے جا سکتے ہیں، لیکن اتنی بات واضح ہے کہ اہل عرب کو دی جانے والی شریعت کے احکام کو غیر عرب اقوام کے لیے لازم نہ سمجھنے کا نقطۂ نظر ان کی طرف کسی طرح منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک قتل، زنا اور چوری وغیرہ کی شرعی سزاؤں کا تعلق ہے تو شاہ صاحب نے اپنی اسی تصنیف میں ان کو الگ سے اور باقاعدہ موضوع بحث بنایا ہے اور غیر مبہم الفاظ میں یہ واضح کیا ہے کہ وہ انھیں اہل عرب کی مخصوص عادات پر مبنی نہیں سمجھتے، بلکہ ان قوانین میں شمار کرتے ہیں جو عرب وعجم کی سب قوموں کے لیے فطری طریقے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک یہ سزائیں دنیا کی تمام اقوام کے لیے لازم ہیں اور انھیں کسی حال میں ترک نہیں کیا جا سکتا۔

فرماتے ہیں:

اعلم انه يجب ان يكون فى جماعة المسلمين خليفة لمصالح لا تتم الا بوجوده وهى كثيرة جدا يجمعها صنفان: احدهما ما يرجع الى سياسة المدينة من ذب الجنود التى تغزوهم وتقهرهم وكف الظالم عن المظلوم وفصل القضايا وغير ذلك ... والنبى صلى اللّٰه عليه وسلم جمع تلك الحاجات فى ابواب اربعة: باب المظالم وباب الحدود وباب القضاء وباب الجهاد. ثم وقعت الحاجة الى ضبط كليات هذه الابواب وترك الجزئيات الى راى الائمة ووصيتهم بالجماعة خيرا.

''جان لو کہ مسلمانوں کی جماعت میں ایک حکمران کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ بہت سے مصالح اس کے وجود کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ یہ مصالح بہت سے ہیں اور انھیں بنیادی طور پر دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ایک وہ جن کا تعلق سیاست مدینہ سے ہے، مثلاً حملہ آور اور قابض ہونے والے لشکروں کی مدافعت، مظلوم کو ظالم کی دست رس سے بچانا اور مقدمات کا فیصلہ وغیرہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام حاجات کو چار ابواب میں جمع فرما دیا ہے: ایک نزاعات، دوسرے حدود، تیسرے قضا اور چوتھے جہاد۔ پھر حاجت پیش آئی کہ ان چاروں ابواب کے کلیات طے کر دیے جائیں، جبکہ جزئیات کو ارباب حل وعقد کی صواب دید پر چھوڑ دیا جائے اور انھیں تاکید کر دی جائے کہ وہ عوام کے بارے میں خیر خواہی کا رویہ اختیار کریں۔''

(حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۳۸۲۔۳۸۳)

اس کے بعد انھوں نے وہ ضروریات اور مصالح بیان کیے ہیں جو اس باب کے کلیات کو ضبط کرنے کے متقاضی ہیں۔ ان میں سے ایک مصلحت یہ ہے کہ جرم اور سزا کے مابین تناسب کی تعیین کو اگر لوگوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ افراط اور تفریط کا موجب ہوتا اور لوگ اس معاملے میں اعتدال پر قائم نہ رہ سکتے، اس لیے یہ مناسب تھا کہ شارع جرم وسزا کے باب میں 'کلیات' کو خود متعین کر دے۔ وہ لکھتے ہیں:

ولا يمكن الاستقصاء فانه كالتكليف بالمحال فيجب ان تكون الاصول مضبوطة فان اختلافهم فى الفروع اخف من اختلافهم فى الاصول

''تمام صورتوں کا حکم بیان کرنا ممکن نہیں تھا، کیونکہ یہ ایک امر محال کا مکلّف ٹھہرانے کے مترادف ہوتا، اس لیے یہ ضروری تھا کہ بنیادی باتیں طے کر دی جائیں (جبکہ فروع کو متعین نہ کیا جائے)، کیونکہ اصول کے

ومنها ان القوانين اذا كانت ناشئة من الشرع كانت بمنزلة الصلاة والصيام فى كونها قربة الى الحق والسنة تذكر الحق عند القوم وبالجملة فلا يمكن ان يفوض الامر بالكلية الى اولى انفس شهوية او سبعية ولا يمكن معرفة العصمة والحفظ عن الجور فى الخلفاء والمصالح التى ذكرناها فى التشريع وضبط المقادير كلها متاتية ههنا. (حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۳۸۳۔۳۸۴)

مقابلے میں فروع میں لوگوں کا اختلاف کرنا نسبتاً قابل برداشت ہے۔ بنیادی سزاؤں کو طے کرنے کی ایک حکمت یہ تھی کہ یہ قوانین جب شارع کی طرف سے بیان کیے جائیں گے تو لوگ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے انھیں نماز اور روزہ کے احکام ہی کے مانند سمجھیں گے، کیونکہ کسی قوم کے ہاں جس چیز کو حق سمجھا جاتا ہے، عملی طریقے اس کی یاددہانی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس معاملے کو نہ تو بالکلیہ خواہشات اور درندگی جیسی خصلت سے مغلوب انسانی نفوس کے سپرد کر دینا ممکن تھا اور نہ یہ ہو سکتا تھا کہ عادل اور انصاف پسند حکمرانوں کو (پیشگی) ممتاز کر لیا جاتا (اور عادلانہ سزاؤں کی تعیین ان کی صواب دید پر چھوڑ دی جاتی)، چنانچہ شرعی قانون سازی اور احکام کی ظاہری صورتوں کو متعین کرنے میں جتنے بھی مصالح پیش نظر ہو سکتے ہیں، وہ سب اس باب میں پائے جاتے ہیں (اور اسی لیے شارع نے بنیادی سزاؤں کی ظاہری صورت کو بھی متعین کر دیا ہے)۔''

ان 'اصول' یعنی بنیادی سزاؤں کی وضاحت کرتے ہوئے جنھیں شریعت نے متعین کر دیا ہے، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

واعلم انه كان من شريعة من قبلنا القصاص فى القتل والرجم فى الزنا والقطع فى السرقة فهذه الثلاث كانت متوارثة فى الشرائع السماوية واطبق عليها جماهير الانبياء والامم

''جان لو کہ قتل کی صورت میں قصاص، زنا کی صورت میں رجم اور چوری کی صورت میں ہاتھ کاٹنے کی سزائیں، ہم سے پہلی شریعتوں میں بھی موجود تھیں۔ یہ تینوں سزائیں آسمانی شریعتوں میں متوارث چلی آ رہی ہیں اور ان پر انبیا اور اقوام عالم کی اکثریت کا اتفاق

ومثل هذا يجب ان يوخذ عليه بالنواجذ ولا يترك ولكن الشريعة المصطفوية تصرفت فيها بنحو آخر فجعلت مزجرة كل واحد على طبقتين: احداهما الشديدة البالغة اقصى المبالغ ومن حقها ان تجعل فی المعصية الشديدة والثانية دونها من حقها ان تجعل فی ما كانت المعصية دونها. (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۴۰۷)	رہا ہے۔ چنانچہ اس طرح کی سزاؤں کو مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہیے اور انھیں چھوڑنا نہیں چاہیے، البتہ شریعت محمدی میں ان سزاؤں میں ایک اور طرح کا تصرف کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر جرم کی سزا کے دو درجے مقرر کیے گئے ہیں: ایک بے حد سخت اور آخری درجے کی سزا جس کا حق یہ ہے کہ اسے سنگین قسم کے جرم میں نافذ کیا جائے اور دوسری اس سے کم تر سزا جس کا حق یہ ہے کہ اسے پہلے کی بہ نسبت کم سنگین جرم میں نافذ کیا جائے۔''

شاہ صاحب کے نزدیک ان سزاؤں میں تخفیف یا رعایت کا فیصلہ بھی نصوص ہی کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ احادیث میں زنا کی سزا کے طور پر زانی کو جلاوطن کرنے کا جو ذکر ہوا ہے، اسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اس طریقے سے متعارض روایات میں تطبیق دی جا سکتی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۴۱۱)

اس تفصیل سے پوری طرح واضح ہے کہ شاہ صاحب خود نصوص کے داخلی قرائن اور شرعی مصالح سے ہٹ کر محض زمان ومکان کی تبدیلی اور انسانی معاشروں کے تہذیبی مزاج کے تنوع کی بنیاد پر سزا کے متبادل طریقے اختیار کرنے کے جواز کے ہرگز قائل نہیں ہیں اور ان کا نقطۂ نظر اس معاملے میں امت کے اہل علم کے متفقہ اور مجمع علیہ موقف کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

جدید تمدنی نفسیات

بعض اہل فکر کی طرف سے شرعی سزاؤں کے نفاذ کے ضمن میں ایک زاویۂ نظر یہ بھی سامنے آیا ہے کہ چونکہ جدید ذہن مختلف تمدنی اور نفسیاتی عوامل کے تحت شرعی سزاؤں سے اجنبیت محسوس کرتا ہے اور ان سزاؤں کا نفاذ نفسیاتی طور پر دین سے دوری کا سبب بن سکتا ہے، اس لیے موجودہ دور میں ان سزاؤں کا نفاذ مصلحت کے خلاف ہے۔ ہماری رائے میں یہ بات اس حد تک تو درست ہے کہ دین کے احکام پر موثر عمل درآمد ان کی اعتقادی واخلاقی اساسات پر مضبوط ایمان اور شکوک وشبہات کا ازالہ کیے بغیر ممکن نہیں، تاہم اس نکتے کی بنیاد پر شرعی سزاؤں کو جدید دور میں کلیتاً ناقابل نفاذ قرار دے کر مستقل بنیادوں پر متبادل سزاؤں کا جواز اخذ کرنا درست نہیں، اس لیے کہ پھر یہ معاملہ قانون

کے عملی نفاذ کی مصلحت تک محدود نہیں رہتا، بلکہ فکر ونظر کے زاویے میں ایک نہایت بنیادی اختلاف کو قبول کرنے تک جا پہنچتا ہے۔ جدید ذہن کو ان سزاؤں پر یہ اشکال نہیں ہے کہ یہ جرائم کی روک تھام میں مددگار نہیں یا ان سے زیادہ موثر سزائیں دریافت کر لی گئی ہیں، بلکہ اسے یہ سزائیں سنگین، متشددانہ اور قدیم وحشیانہ دور کی یادگار دکھائی دیتی ہیں اور وہ انھیں انسانی عزت اور وقار کے منافی تصور کرتا ہے۔ زاویۂ نگاہ کا یہ فرق قانون کی مابعدالطبیعیاتی اور اعتقادی بنیادوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اسلام خدا کے سامنے مکمل تسلیم اور سپردگی کا نام ہے۔ یہ سپردگی مجرد قسم کے ایمان واعتقاد اور بعض ظاہری پابندیوں کو بجالانے تک محدود نہیں، بلکہ انسانی جذبات واحساسات بھی اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ محبت، نفرت، ہمدردی اور غصے جیسے جذبات اور حب ذات، آزادی اور احترام انسانیت جیسے احساسات و تصورات نفس انسانی میں خدا ہی کے ودیعت کردہ اور اس اعتبار سے بجاے خود خدا کی امانت ہیں۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک ان کا اظہار اسی دائرۂ عمل میں اور اسی حد تک قابل قبول ہے جب تک وہ خدا کے مقرر کردہ حدود کے پابند رہیں۔ اس سے تجاوز کرتے ہوئے اگر ان کو کوئی مقام دیا جائے گا تو یہ خدا کی امانت کا صحیح استعمال نہیں، بلکہ اس میں خیانت کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ جدید انسانی نفسیات اگر جرم وسزا سے متعلق قرآنی احکام سے نفور محسوس کرتی ہے تو یہ محض قانون کی مصلحت یا اس کے سماجی تناظر کے بدل جانے کا مسئلہ نہیں، بلکہ اس کی جڑیں قانون کی مابعدالطبیعیاتی اساسات میں پیوست ہیں اور اس معاملے میں جدید فکر کے ساتھ کمپرومائز کا جواز فراہم کرنے کے لیے 'اجتہاد' کے دائرے کو ایمان واعتقاد تک وسیع کرنا پڑے گا۔

سزاؤں سے متعلق مذکورہ زاویۂ نگاہ کی خامی کا یہ پہلو بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ مغربی مفکرین اخلاقیات اور انسانی فطرت کے بے حد محدود اور ناقص فہم کے تحت اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کسی انسان کی جان ومال اور عزت و آبرو اسی وقت تک احترام اور تحفظ کی مستحق ہے جب تک وہ قانونی اور اخلاقی حدود کو پامال نہ کرے۔ نیز یہ کہ جرم ضروری نہیں کہ ہمیشہ کسی نفسیاتی عدم توازن کا نتیجہ ہو اور مجرم کو اپنے ارادہ واختیار کے سوء استعمال کا قصوروار نہ ٹھہرایا جا سکے۔ انسان کی فطرت میں شر کا ایک قوی عنصر موجود ہے جس کے زیر اثر وہ دانستہ دوسرے انسانوں کے حقوق پر تعدی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اس کے لیے اسے اخلاقی طور پر پوری طرح ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہل مغرب کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئی ہے کہ معاشرتی جرائم پر موثر طریقے سے قابو پانا سخت اور سنگین سزاؤں ہی کی مدد سے ممکن ہے، جبکہ انسانی حقوق کے اس فلسفے کے زیر اثر جرم وسزا کے باب میں مجرم کے ساتھ ہمدردی کا ایک نہایت غیر متوازن رویہ اپنا کر مغربی فکر ایک عجیب تضاد کا شکار ہو گئی ہے۔ چنانچہ ایک برطانوی مصنفہ

Joanna Bourke نے اپنی کتاب "Rape: A history from 1860 to the present" میں ایک طرف یہ بیان کیا ہے کہ اعداد وشمار کے مطابق برطانیہ میں زنا بالجبر کے رپورٹ ہونے والے واقعات میں سے صرف پانچ فیصد مقدمات میں مجرم کیفر کردار کو پہنچتا ہے اور یہی امر مصنفہ کے لیے اس کتاب کی تصنیف کا محرک بنا ہے، لیکن جب اس کے سدباب کی بات آتی ہے تو مصنفہ تجویز کرتی ہے کہ ایسے مجرموں کو کوئی سخت سزا دینے کے بجائے دواؤں اور نفسیاتی بحالی کے طریقوں سے ان کا علاج کیا جائے۔ (Daily Dawn, Books and Authors, January 13, 2008, page 1)

ظاہر ہے کہ یہ طرز فکر نہ انسانی فطرت کے صحیح فہم کی عکاسی کرتا ہے، نہ اس سے عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور نہ جرائم کی روک تھام میں ہی اس سے کوئی مدد مل سکتی ہے۔

سیرت النبی

خالد مسعود

ہجرت حبشہ

[''سیر وسوانح'' کے زیرعنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

کفار کی جانب سے مسلمانوں کو جو آزمایشیں پیش آ رہی تھیں، قرآن مجید ان کا عزم وحوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرنے کا حکم دیتا اور بشارت دیتا کہ جو لوگ ثابت قدم رہیں گے، ان کو ان کی قربانی کا صلہ ان کی توقعات، اندازوں اور قیاسوں سے بڑھ چڑھ کر ملے گا۔ قرآن نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ اگر دیکھو کہ تمھارے وطن کی زمین تم پر تنگ کر دی گئی ہے جب بھی بددل اور مایوس نہ ہونا۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ اگر اس شہر میں تمھارے لیے اللہ کے دین پر قائم رہنا ناممکن بنا دیا گیا تو اللہ تمھاری رہنمائی کسی ایسی سرزمین کی طرف فرمائے گا، جہاں تم بے خوف وخطر اپنے رب کی عبادت کرسکو گے۔ اللہ تمھیں جاے پناہ عطا فرمائے گا اور رزق بہم پہنچائے گا۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ کتنے جان دار، چرند، پرند ایسے ہیں جو اپنے ساتھ اپنی روزی باندھے نہیں رکھتے، لیکن ان کا رب ان کو رزق دیتا ہے اور وہ شکم سیر ہو کر رات کو اپنے ٹھکانوں پر واپس آتے ہیں۔ لہٰذا تم بھی اپنے رب پر بھروسا کرو۔ وہ تمھاری مشکلیں آسان فرمائے گا۔ فرمایا:

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ. کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ. وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، بے شک میری زمین بڑی کشادہ ہے تو بس میری ہی بندگی کرو۔ ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تم ہماری ہی طرف

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا . نِعْمَ اَجْرُالْعٰمِلِيْنَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ. وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ العَلِيْمُ. (العنکبوت۲۹: ۵۶-۶۰)

لوٹائے جاؤ گے۔ اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، ہم ان کو جنت کے بالا خانوں میں متمکن کریں گے۔ اس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کا، جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہر حال میں انھوں نے بھروسا رکھا۔ اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

جب قریش کے ظلم وستم کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا گیا تو اہل ایمان کے لیے مکہ کی سرزمین واقعی تنگ ہو گئی۔ اسلام کا نام لے کر کوئی شخص اپنے آپ کو معاشرہ کے غیظ وغضب سے بچا نہیں سکتا تھا۔ اسی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ خداوندی میں درخواست کی کہ اے رب، اسلام کو عمرو بن ہشام یا عمر بن الخطاب کے اسلام سے قوت بخش۔ عمرو بن ہشام ابوجہل کا نام ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں پیش پیش تھا اور عمر بن الخطاب ایک دبنگ نوجوان کے طور پر معروف تھے اور ان کا دل پسند مشغلہ کمزور مسلمانوں کو تنگ کرنا تھا۔ مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکوہ کرتے کہ ان کی زندگی سخت عذاب میں ہے تو حضور تسلی دیتے کہ حوصلہ رکھو، اللہ تعالیٰ آسانی کی راہ نکالے گا۔ تم سے پہلی قومیں بھی مخالفین کے ہاتھوں بے حد تنگ ہوئیں، یہاں تک کہ ان کے سروں پر آرے چلا دیے گئے، لیکن وہ اپنے دین سے دست بردار نہ ہوئیں۔

جب حالات تشویش ناک حد تک نازک ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو خاص طور پر مصائب کا نشانہ بنے ہوئے تھے، حبشہ کی جانب ہجرت کی اجازت دی، کیونکہ وہاں کا عیسائی حکمران اصحمہ اپنی رحم دلی اور عدل گستری کی بڑی شہرت رکھتا تھا اور اس کے ملک میں امن وامان کا دور دورہ تھا۔ دوسرے یہ ملک عرب سے مغرب میں بحر قلزم کے پار ہونے کے باعث نہایت قریب بھی تھا۔ عجیب بات ہے کہ قریش کے تقریباً تمام خانوادوں کے نوجوان مسلمان ہجرت کرنے میں پیش پیش تھے۔ پہلا گروپ جس نے ہجرت کی، گیارہ مردوں اور پانچ خواتین پر مشتمل تھا۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

بنوامیہ: حضرت عثمان بن عفان مع زوجہ رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بنوعبدشمس: حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ مع زوجہ سہلہ بنت سہیل بن عمرو

بنومخزوم: حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مع زوجہ ام سلمہ

بنواسد: حضرت زبیر بن العوام

بنوعبدالدار: حضرت مصعب بن عمیر

بنوزہرہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف

بنوجمح: حضرت عثمان بن مظعون

بنوعدی: حضرت عامر بن ربیعہ مع زوجہ لیلیٰ بنت ابی حثمہ

بنوعامر: حضرت ابوسبرہ بن ابی رہم مع زوجہ ام کلثوم بنت سہیل۔ حاطب بن عمرو

بنوحارث: حضرت سہیل بن بیضاء

اس سے معلوم ہوا کہ دین کی خاطر اپنوں سے جدائی کا صدمہ جہاں ان نوجوان مسلمانوں کو سہنا پڑا، وہیں اس سے قریش کے بیش تر خانوادے بھی متاثر ہوئے۔ سیرت نگاروں کے بقول یہ ہجرت رجب ۵ نبوی میں ہوئی۔

پہلے گروپ کے حبشہ بخیروعافیت پہنچنے اور وہاں کی حکومت کے اس پر اعتراض نہ کرنے کی خبر جب مسلمانوں کو ملی تو پھر ہجرت کرنے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ بعض نمایاں نام یہ ہیں:

بنوہاشم: حضرت جعفر بن ابی طالب مع زوجہ اسماء بنت عمیس

بنوامیہ: حضرت خالد بن سعید بن العاص۔ عروہ بن سعید بن العاص مع زوجہ فاطمہ بنت صفوان بن امیہ

بنواسد: حضرت عبداللہ بن جحش۔ عبیداللہ بن جحش مع زوجہ ام حبیبہ بنت ابی سفیان

بنوعامر: حضرت سکران بن عمرو مع زوجہ سودہ بنت زمعہ۔ عبداللہ بن سہیل بن عمرو

بنوحارث: حضرت ابوعبیدہ بن الجراح

ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عتبہ بن مسعود اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کے نام آئے ہیں۔ یہ تعداد اسی (۸۰) سے متجاوز تھی۔ ظاہر ہے کہ مکہ سے ہر مسلمان نے ہجرت نہیں کی، بلکہ انھی لوگوں نے کی جو قریش کے ظلم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ باقی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسب فیض کے لیے وہیں رہے۔

قریش کا تعاقب

قریش نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کو حبشہ میں ایک پناہ گاہ میسر آ گئی ہے اور وہ امن اور سکون سے وہاں زندگی گزارنے لگے ہیں تو انھوں نے وہاں بھی ان کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا اور دو آدمی عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ اصحمہ کے دربار میں جانے کے لیے تیار کیے۔ یہ دونوں بادشاہ کے حضور پیش کرنے کے لیے ہدایا تو لے کر ہی گئے، ان کے علاوہ اس کے مذہبی رہنماؤں کے لیے بھی تحائف لے کر گئے۔ انھوں نے پہلے مذہبی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور دربار میں تعاون کی ان سے یقین دہانی حاصل کی۔ اس کے بعد شاہ نجاشی کے دربار میں پیش ہو کر درخواست کی کہ اے بادشاہ، ہمارے کچھ بیوقوف نوجوان آپ کے ملک میں آئے ہیں۔ یہ اپنا آبائی دین چھوڑ چکے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ یہ ایک نیا دین پیش کرتے ہیں جس سے نہ ہم واقف ہیں نہ آپ۔ ان کے بزرگوں نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ ان کو واپس بھجوائیں، کیونکہ ان کے بزرگ ہی ان پر ٹھیک نظر رکھ سکتے ہیں۔ نجاشی نے درباریوں اور مذہبی رہنماؤں کی رائے لی تو سب نے قریش کے وفد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن نجاشی نے کہا کہ جن لوگوں نے میری پناہ پکڑی اور دوسروں کے مقابل میں انھوں نے میرا اور میرے ملک کا انتخاب کیا، میں ان کو تمھارے حوالے کیسے کر دوں، جب تک کہ میں اس معاملہ میں ان کا نقطۂ نظر نہ جان لوں۔

بادشاہ نے اپنا ایلچی بھیج کر مسلمانوں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ جو ہو سو ہو، ہم وہی صحیح حقیقت حال بیان کریں گے جس کی تعلیم ہمیں اللہ کے رسول نے دی ہے۔ جب وہ حاضر ہوئے تو نجاشی نے قریش کا بیان ان کے سامنے رکھا اور جواب طلب کیا۔ مہاجرین کی جانب سے حضرت جعفر بن ابی طالب کھڑے ہوئے اور بیان کیا کہ اے بادشاہ، اس دین کو اختیار کرنے سے پہلے ہم بتوں کی پوجا کرتے، مردار کھاتے، قطع رحمی کرتے، بے حیائی کے کاموں میں شریک ہوتے۔ ہم اس حال میں تھے کہ اللہ نے ہماری طرف اپنا رسول بھیجا۔ اس کی خاندانی وجاہت، سچائی، پاکیزگی اور امانت سے ہم پہلے سے واقف تھے۔ اس نے ہمیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلایا اور پتھروں کی پوجا سے روکا۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت و دیانت داری، صلہ رحمی، اچھی ہمسائیگی، نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے اور شرک نہ کرنے کا حکم دیا اور جھوٹ، تہمت، یتیم کا مال کھانے، بے حیائی اور دوسرے محرمات سے رکنے کی ہدایت کی۔ ہم نے اس کی تصدیق کی، اس پر ایمان لائے اور اس کے لائے ہوئے پیغام کی پیروی کی۔ ہماری قوم نے ہم پر بڑی زیادتیاں کیں، ہم کو سزائیں دیں اور ہمارے دین سے ہمیں پھیرنا چاہا۔ جب ہماری زندگی اجیرن کر دی گئی تو ہم آپ کے ملک میں آ گئے اور پناہ کے لیے اس ملک کو چنا۔ ہمیں توقع ہے کہ آپ کے ہاں ہم پر

زیادتی نہیں ہوگی۔ یہ سن کر نجاشی نے قریش کے وفد کی درخواست رد کر دی۔

عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ دربار سے ناکام لوٹے تو مشورہ کر کے نجاشی کے دینی جذبات کو بھڑکانے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن دوبارہ دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ نیا دین پیش کرنے والا آپ کے پیغمبر عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے بارے میں بڑی غلط باتیں منسوب کرتا ہے۔ نجاشی نے دوبارہ مسلمانوں کو طلب کیا اور ان کا نقطۂ نظر معلوم کیا۔ حضرت جعفر نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کر دی، جس میں مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کی پوری تعلیم موجود ہے۔ نجاشی سنتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ جب تلاوت ختم ہوئی تو حضرت جعفر نے کہا کہ اس کی رو سے حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی روح اور اس کا کلمہ تھے جو کنواری مریم کے حوالہ کیا گیا۔ نجاشی نے کہا کہ اللہ کی قسم، تم نے جو کچھ کہا، یہ تعلیم اور عیسیٰ علیہ السلام جو کچھ لائے، ایک ہی منبع سے نکلنے والی روشنی ہیں۔

اس صورت حال کو دیکھ کر قریش کے وفد کو نامراد لوٹنا پڑا اور مسلمانوں نے بادشاہ کے دل میں اسلام کا نور ڈال دیا جس کے نتیجہ میں وہ بعد میں مسلمان ہو گیا۔ نجاشی کے ردعمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق نصاریٰ کے اس گروہ سے تھا جو پال کی بدعات کے خلاف اور صحیح دین مسیحی کو اختیار کیے ہوئے تھا۔ یہی وہ لوگ تھے کہ جب ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پہنچتی تو قرآن میں آتا ہے کہ اس کو سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے، کیونکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی کا مصداق اس کے اندر پاتے۔ ان لوگوں نے بالعموم اسلام قبول کر لیا۔

حبشہ کے عیسائی وفد کا قبول اسلام

صحیح نصرانیت پر قائم لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یا تثلیث (TRINITY) کا ایک رکن نہیں مانتے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ مسیح علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق وہ نبی آخر الزماں پر اس وقت ایمان لے آئیں، جب ان کی بعثت ہو۔ مسلمانوں کی حبشہ آمد نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات کی تصدیق کر دی۔ انھوں نے مسلمانوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی تعلیمات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ قریش کے اہل ایمان پر ظلم و ستم کے واقعات سنے اور خود مسلمانوں کے کردار کا مشاہدہ کیا۔ چنانچہ ان کا ایک گروہ، جس میں بیس افراد شامل تھے، خود اپنی آنکھوں سے تمام احوال کا مشاہدہ کرنے اور اللہ کے آخری رسول سے ملاقات کے لیے مکہ آیا۔ انھوں نے ایک مجلس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بکثرت سوالات کر کے اطمینان کر لیا کہ یہ رسول ان

علامات پر پورے اترتے ہیں جن کی تعلیم اب تک ان کو دی جاتی رہی تھی۔ ان کے سوالات کے جواب دینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موقع ومحل کے مطابق ان کے سامنے قرآنی آیات کی تلاوت کی۔ اس کلام نے ان کے رہے سہے شکوک کا ازالہ کر دیا۔ ان کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں، کیونکہ حق ان پر آشکارا ہو چکا تھا۔ ان خوش نصیبوں نے قبول حق میں ذرا سی دیر بھی گوارا نہیں کی۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے۔ اس کے بعد یہ لوگ حبشہ روانہ ہو گئے، کیونکہ ان کا مقصود مکہ میں قیام کرنا نہ تھا[1]۔ ظاہر ہے کہ اسلام کی باقی تفصیلات انھوں نے ان مسلمانوں سے حاصل کی ہوں گی جو حبشہ کو ہجرت کر چکے تھے۔ یہ ہجرت حبشہ کا ایک ایسا ثمرہ تھا جس کا تصور بھی قریش نے نہ کیا ہو گا۔ اس کے بعد نجاشی کو بھی خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خط لکھ کر اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس عادل حکمران کے حق میں دعا فرماتے رہے۔

کفار مکہ عیسائی گروہ کے اسلام قبول کرنے پر بے حد سیخ پا ہوئے۔ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے ان حق پرست لوگوں کو احمق قرار دیا کہ وہ آئے تو تھے حقیقت حال کا مشاہدہ کرنے اور بے سوچے سمجھے مسلمان ہو کر واپس ہو لیے۔

اس واقعہ نے قریش کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ اگر لوگ یہاں آ کر محمد سے متاثر ہوتے رہے تو وہ اس کا پیغام دوسرے قبائل تک پہنچا دیں گے اور اگر یہ دعوت مکہ کے بیرون میں جڑ پکڑ گئی تو ان کے لیے مزید پریشانیاں پیدا کر سکتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے بیرون مکہ سے آنے والوں پر بھی نظر رکھنا شروع کی اور اگر ان میں سے کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کی کوشش کرتا تو اس کی پٹائی کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔

عمرو بن عبسہ السلمی کا قبول اسلام

عمرو بن عبسہ زمانۂ جاہلیت میں حنفا میں سے تھے۔ وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جو لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں، وہ گمراہی پر ہیں اور ان کی کوئی بنیاد نہیں۔ انھوں نے سنا کہ مکہ میں ایک شخص ایک نیا دین پیش کر رہا ہے۔ انھیں اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوئی تو سواری لے کر مکہ جا پہنچے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس شخص کی قوم اس کی دشمن ہو رہی ہے اور کسی کو اس سے ملنے نہیں دیتی۔ کہتے ہیں کہ میں نے جستجو کی اور چھپ چھپا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا۔ میں نے پوچھا: 'آپ کیا ہیں'؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'میں اللہ کا نبی ہوں'۔ میں نے پوچھا: 'نبی کیا ہوتا ہے!' آپ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے ایک پیغام دے کر بھیجا ہے۔ میں نے پوچھا: 'اللہ نے آپ کو کون سا پیغام دے کر بھیجا

---

[1] السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳۹۱۔۳۹۲۔

ہے۔ آپ نے فرمایا: 'صلہ رحمی اور بت شکنی کا پیغام، اور یہ کہ اللہ کو ایک مانا جائے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا جائے'۔ میں نے پوچھا کہ اس تعلیم میں آپ کا ساتھ کون دے رہے ہیں۔ آپ نے بتایا: آزاد اور غلام دونوں۔ میں نے کہا: 'میں بھی آپ کا پیروکار بنتا ہوں'۔ آپ نے جواب دیا: 'ابھی تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ دیکھتے نہیں کہ میرے معاملہ میں لوگوں کا حال کیا ہے۔ تم اس وقت واپس لوٹ جاؤ۔ پھر جب سنو کہ میں غالب آ گیا ہوں تم میرے پاس آ جانا'۔ عمرو کہتے ہیں کہ میں واپس اپنے قبیلے میں لوٹ گیا۔ میں آپ کے بارے میں ٹوہ میں لگا رہتا اور لوگوں سے دریافت کرتا رہتا۔ یہاں تک کہ اہل یثرب میں سے کچھ لوگ میرے ہاں آئے۔ انھوں نے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ مدینہ آ گئے ہیں اور لوگ آپ پر ایمان لانے کے لیے بھاگم بھاگ ان کے پاس آ رہے ہیں۔ ان کی قوم نے ان کی جان لینی چاہی، لیکن وہ اس پر قادر نہ ہو سکی۔ کہتے ہیں: یہ سن کر میں مدینہ گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا۔ آپ نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ میں نے اس موقع پر آپ سے نماز اور وضو کے مسائل دریافت کیے[۲]۔

اس واقعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنا بے حد مشکل بنا دیا گیا تھا۔ عمرو بن عبسہ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کے خواہش مند رہے ہوں گے، لیکن آپ نے ان کو مشورہ دیا کہ اپنے قبیلہ کو واپس جائیں اور اسلام کے غلبہ کا انتظار کریں۔

ابوذر غفاری کا قبول اسلام

قبیلۂ غفار کے ابوذر کو کہیں سے معلوم ہوا کہ مکہ میں کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے بھائی انیس کو مکہ بھیجا کہ اس شخص کے بارے میں معلومات لے کر آئیں۔ انیس مکہ گئے اور تحقیق کے بعد بھائی کو جا کر بتایا کہ وہ شخص اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے اور ایسا کلام پیش کرتا ہے جو نہ شعر ہے نہ کہانت۔ ابوذر کو ان معلومات سے تشفی نہیں ہوئی تو انھوں نے خود رخت سفر باندھا اور مکہ پہنچ گئے۔ مسجد حرام میں اترے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جستجو کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کسی سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ رات گئے حضرت علی ان کو مسافر سمجھ کر اپنے گھر لے گئے اور صبح دم وہ پھر مسجد میں آ گئے۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی ایسا ہی ہوا۔ بالآخر حضرت علی نے ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا تو ابوذر نے ان سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ کسی سے اس کا تذکرہ نہ کریں گے۔ جب مقصد بتایا تو حضرت علی نے کہا کہ بلاشبہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اگلی صبح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات کرائی تو

۲؎ سیرۃ النبی (مترجم)، ابن کثیر، مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور، ۲۸۱۔

ابوذر نے اسلام قبول کر لیا۔ آپ نے ہدایت فرمائی کہ اس وقت واپس چلے جاؤ اور اپنی قوم کو آگاہ کرو۔ البتہ، جب تک میرے بارے میں تمھیں اطلاع نہیں پہنچتی، وہیں رہنا۔ ابوذر کہنے لگے: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میں لوگوں کے سامنے اپنے اسلام کا اظہار کر کے جاؤں گا۔ وہ مسجد میں گئے اور بلند آواز سے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ لوگ ان کے اوپر پل پڑے اور مار مار کر گرا دیا۔ عباس بن عبدالمطلب کی نظر پڑی تو لوگوں کو ہٹایا اور کہا کہ تم جانتے نہیں ہو کہ یہ شخص بنوغفار سے تعلق رکھتا ہے اور یہ قبیلہ شام کے راستے میں تمھاری تجارتی شاہراہ پر آباد ہے۔ تب ابوذر کی خلاصی ہوئی اور انھوں نے اپنی راہ لی[۳]۔

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والوں کے لیے قریش نے کیسی فضا بنا رکھی تھی کہ کوئی شخص کھل کر نہ رسول اللہ کا نام لے سکتا تھا اور نہ ان سے ملاقات کر سکتا تھا۔ اگر اتفاق سے کوئی جری شخص آپ سے مل لیتا تو مار پیٹ سے اس کی تواضع کی جاتی۔ اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو یہی مشورہ دیتے کہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں رہیں اور جب غلبہ کی خبر سنیں تو پھر رابطہ کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی قبولیت اور حضرت عمر کا اسلام

مکہ سے ایک بڑی تعداد میں مسلمانوں کا محض اس لیے نکل جانا کہ وہ اپنے دین کو بچا سکیں اور بھرے ہوئے آسودہ گھروں کو خیرباد کہہ دینا، جیسے ان کے در و دیوار ان کو کاٹتے ہوں، اتنا غیر معمولی واقعہ تھا کہ اس نے مکہ کی بقیہ آبادی کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ اپنے جذباتی موقف کا جائزہ لینے پر آمادہ ہوئی۔ انھی لوگوں میں ایک بڑا نام عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ہے جو ہجرت حبشہ کے بعد ۶ نبوی میں مسلمان ہوئے۔

حضرت عمر کے اسلام لانے کے بارے میں دو روایتیں نقل ہوئی ہیں:

پہلی روایت: حضرت عمر کے اسلام لانے کے بارے میں جو روایت شہرت پا چکی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو العیاذ باللہ قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکلے۔ راستہ میں حضرت نعیم بن عبداللہ سے ملاقات ہو گئی جو مسلمان ہو چکے تھے۔ انھوں نے پوچھ لیا: کہاں کا ارادہ ہے؟ بولے: محمد کا فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا: پہلے گھر کی خبر لو۔ تمھاری بہن اور بہنوئی حضرت سعید بن زید بھی اسلام لا چکے ہیں۔ عمر بہن کے گھر پہنچے۔ وہاں

---

[۳] صحیح مسلم، باب من فضائل ابی ذر، ۳۸۸۔

میاں بیوی حضرت خباب بن الارت سے قرآن پڑھ رہے تھے۔ جب معلوم ہوا کہ عمر آ گئے تو انھوں نے قرآن کے صفحات چھپا دیے۔ چونکہ عمر بن الخطاب نے قرآن پڑھتے ان کو سن لیا تھا، اس لیے مصر ہوئے کہ بتاؤ تم لوگ کیا پڑھ رہے تھے۔ میاں بیوی نے جب کچھ نہیں بتایا تو عمر نے دونوں کو مار مار کر لہولہان کر دیا۔ ان کا جواب یہ تھا کہ عمر، تم جو چاہے کر لو اب اسلام کی محبت دل سے نکل نہیں سکتی۔ عمر قدرے ٹھنڈے ہوئے تو بہن نے سورۂ طٰہٰ (یا بروایت بعض سورۂ حدید) کے صفحات ان کے آگے رکھ دیے۔ پڑھتے ہی ان کے دل کی کیفیت بدل گئی۔ خباب سے پوچھا: آں حضرت کہاں ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ وہ کوہ صفا کے قریب ایک گھر میں ہیں۔ عمر تلوار لٹکائے ہوئے وہاں پہنچے۔ کسی نے دروازے کے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا اور گھبرا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دروازہ کھولنے کا حکم دیا اور عمر نے اسلام قبول کر لیا۔ ابن اسحاق کے مطابق یہ روایت اہل مدینہ سے ان کو پہنچی[۴]۔

اس روایت کی شہرت کے باوجود اس پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں، لیکن ان کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا:

۱۔ عرب کی قبائلی زندگی میں کسی دوسرے قبیلہ کے ایک فرد کا قتل بڑے دوررس نتائج کا حامل ہوتا تھا۔ یہ کام اگر آسان ہوتا تو قریش کے تمام خانوادے بنو ہاشم پر یہ زور نہ دیتے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خود روکیں۔ انھیں یہی خطرہ تھا کہ اگر ہم کوئی ایسا اقدام کر گزرے تو مکہ کے اندر ایک طویل جنگ چھڑ جائے گی جس سے عہدہ برآ ہونا کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

۲۔ حضرت عمر جہاں دیدہ اور زیرک آدمی تھے۔ وہ اس حقیقت کو جانتے ہوئے قتل جیسا اقدام نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ ان کا قبیلہ بنو عدی بنو ہاشم کے مقابل میں بے حد کمزور تھا۔

۳۔ حضرت سعید بن زید اور حضرت فاطمہ بنت الخطاب قدیم الاسلام صحابی ہیں، جو بعثت نبوی کے فوراً بعد مسلمان ہوئے تھے۔ ان کا اسلام پوشیدہ بھی نہیں تھا کہ اس کی بھنک گھر کے افراد کے کانوں میں نہ پڑ سکتی۔ پانچ سال کے عرصہ میں تو ہر مسلمان معلوم و معروف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پورا قبیلۂ قریش ان کو سبق سکھانے پر تلا ہوا تھا اور وہ علی الاعلان حبشہ کو ہجرت کر رہے تھے۔ اس روایت سے یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے وہ ۶ نبوی میں اس واقعہ سے ذرا پہلے مسلمان ہوئے ہوں۔

۴۔ حضرت عمر کا اصرار کہ بہن وہ چیز سنائیں جو پڑھ رہی تھیں، ظاہر کرتا ہے کہ ان کے کان ابھی تک قرآن سے

---

[۴] السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳۴۳۔ ۳۴۶۔

نا آشنا تھے، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تو فریضۂ منصبی ہی لوگوں کو قرآن سنانا تھا۔ آپ کئی مرتبہ قریش کے لیڈروں کو قرآن سنا چکے تھے اور خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھتے ہوئے خود بھی ایسی آواز سے پڑھتے تھے جو دوسرے لوگ سن سکیں۔ روایت کا یہ تاثر حقیقت سے بعید ہے۔

۵۔ حضرت فاطمہ کا صحیفہ سے پڑھنا اور پھر اس کو چھپا دینا بھی خلاف حقیقت ہے۔ مسلمانوں کی کس مپرسی کے ان ایام میں قرآن کی تحریر کا اہتمام کرنا اور پھر اس سے پڑھنا پڑھانا ناممکن تھا۔ قریش میں بھی بہت کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، چہ جائیکہ خواتین معمولاً کوئی صحیفہ پڑھنے پر قادر ہو سکتیں۔ اسی طرح حضرت خباب ایک غلام تھے۔ ان کا پڑھا لکھا ہونا ثابت کرنا ہوگا۔

۶۔ سورۂ حدید بالاتفاق مدنی سورہ ہے۔ ۶ نبوی میں اس کا نزول نہیں ہوا تھا۔

۷۔ دارارقم ایک مدت سے مسلمانوں کا مرکز تھا جسے ہر مکی جانتا تھا۔ روایت میں اس کا تذکرہ اس طرح ہوا ہے، جیسے وہ کوئی غیر معروف مکان ہو جو پہلی مرتبہ حضرت عمر کے علم میں آ رہا ہو۔

۸۔ روایت کا تاثر یہ ہے، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مکان میں چھپے ہوئے ہوں۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد و رفت نہ صرف مسجد حرام میں، بلکہ قریش کی مجالس میں بھی رہتی۔ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں بہ آواز بلند قراءت کیا کرتے اور قریش خانہ کعبہ کے پردوں میں چھپ کر اس کو سنا کرتے۔ اور یہ اس دور میں بھی ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مخالفت بڑے زوروں پر تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنا کبھی کسی کے لیے مسئلہ نہیں بنتا تھا۔ اللہ کا رسول ہمیشہ اپنا کام ڈنکے کی چوٹ کرتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے اس کام پر مامور ہوتا ہے اور اللہ خود اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اسے چھپنے چھپانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

دوسری روایت: حضرت عمر کے اسلام لانے کے بارے میں دوسری روایت حضرت ام عبداللہ بنت ابی حثمہ کی ہے۔ حضرت عامر بن ربیعہ حضرت عمر کے خاندان کے حلیف تھے۔ ان کا کنبہ حبشہ جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ عمر آ گئے اور کھڑے ہو کر تیاری کا سماں دیکھنے لگے۔ اب تک ان کا رویہ نہایت سخت رہا تھا اور انھوں نے اس کنبہ کو بہت تکلیفیں دی تھیں۔ عمر پوچھنے لگے: اے ام عبداللہ، روانہ ہو رہی ہو؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ تم لوگوں نے بہت سخت اذیتیں دیں اور ہم پر ظلم ڈھایا۔ اب ہم اللہ کی زمین میں نکل جائیں گے یہاں تک کہ اللہ کوئی راہ کھولے۔ عمر نے کہا: اچھا، اللہ تمھارا ساتھی ہو۔ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی، دل میں رقت طاری ہو گئی اور وہ اسی کیفیت میں وہاں سے چلے گئے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اس قبیلہ کی روانگی سے دلی صدمہ پہنچا ہے۔ حضرت ام عبداللہ

نے اپنے شوہر کو بتایا کہ آج اگر تم عمر کو دیکھتے تو ان پر رقت اور غم کے اثرات دیکھتے۔ مجھے تو ان کے اسلام لانے کی امید پیدا ہوگئی ہے۔[۵]

یہ روایت بالکل فطری معلوم ہوتی ہے۔ ایک گھرانا، جس کے ساتھ برسوں کا بھائی چارا رہا ہو، افراد خانہ سے قلبی تعلق ہو، ایک وقتی مسئلہ پر جذبات کی شدت میں آدمی نے ان کے ساتھ اس قدر زیادتی کی ہو کہ وہ اپنا گھر چھوڑنے پر تیار ہوجائے، لیکن اپنے نظریات پر آنچ نہ آنے دے، جب فی الواقع سامان باندھ لیتا ہے تو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کے جذبات میں بھی ارتعاش پیدا ہوجاتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ خرابی کہیں میرے اندر ہی نہ ہو اور انھی لوگوں کے نظریات درست نہ ہوں۔ اس طرح کے واقعات زندگی کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کی سوچ اسی واقعہ نے بدل دی اور کچھ عرصہ غور کرنے کے بعد انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

عطا اور مجاہد کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمر رات کو کسی وقت مسجد حرام پہنچے۔ دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ انھیں قرآن سننے کا شوق ہوا تو حطیم کی جانب سے غلاف کعبہ کے پیچھے داخل ہوئے اور چھپ کر عین اس جگہ پہنچے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ جب نماز ختم ہوئی اور آپ گھر کو چلے تو یہ آپ کے پیچھے ہولیے۔ جب آپ اپنے گھر کے قریب پہنچے تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے پوچھا: عمر، اس وقت کہاں؟ انھوں نے کہا: میں اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے ان کو ہدایت پر استقامت کی دعا دی اور مکہ کا یہ بطل جلیل اسلام کا خادم بن گیا۔[۶] اگلے ہی روز مسجد میں جا کر اعلان کیا کہ میں مسلمان ہوگیا ہوں اور اب علانیہ یہاں نماز پڑھوں گا، جو مجھے روک سکتا ہو روک کر دکھائے۔

حضرت عمر بن الخطاب کے اسلام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے حق میں دعا قبول ہوگئی۔ اس سے مسلمانوں کو بڑا حوصلہ ملا اور قریش کو اپنی شکست کا احساس ہوا۔

ہجرت حبشہ کے کچھ عرصہ بعد حضرت عمر کا اسلام لانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس واقعہ نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور انھی کو نہیں، بلکہ متعدد دوسرے قرشی نوجوانوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا، کیونکہ قریش کی توقع کے برعکس اس واقعہ کے بعد لوگوں کے مسلمان ہونے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور اسلامی کاروان بڑھتا چلا گیا۔

۵۔ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳۴۲۔

۶۔ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳۴۸۔

مسلمانوں کو غلبہ کی بشارت

ہجرت حبشہ نے ایک اور پہلو سے بھی قریش کو متاثر کیا۔ وہ یہ کہ حبشہ میں مسلمانوں کی پذیرائی اور شاہ حبشہ کے اسلام کی جانب میلان نے قریش کے اندر عیسائیوں کے لیے ایک نفرت سی بٹھا دی، جبکہ مسلمان ان کے ممنون تھے اور ان کے حق میں تعریفی کلمات ادا کرتے۔

ملک عرب سے باہر، لیکن اس سے متصل دو عظیم بادشاہتیں، ایرانیوں اور رومیوں کی تھیں۔ ایرانی مشرک تھے جبکہ رومی پال کی لائی ہوئی بدعات کے باوجود خدا کی وحدانیت کا اقرار کرنے والوں میں تھے۔ قریش کو عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی، وہ سب کو ایک ہی طرح کا مذہبی گروہ سمجھتے۔ ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان شام کے علاقہ میں بالعموم سرحدی جھگڑے پیدا ہوتے اور کبھی نوبت باقاعدہ جنگ کی پیدا ہو جاتی۔ ۶۱۶ء میں ایران نے قیصر روم کے علاقہ پر چڑھائی کی تو رومی فوجیں مقابلہ نہ کر سکیں اور ان کے بہت سے علاقہ پر خسرو پرویز کا قبضہ ہو گیا۔ وہ لڑائی کے نتیجہ کے بارہ میں اتنا پر امید ہوا کہ قیصر روم کو پابند سلاسل دیکھنے کے خواب دیکھنے لگا۔ یہ اطلاعات جب مکہ پہنچیں تو قریش نے مسلمانوں کا مذاق اڑانا شروع کیا کہ دیکھ لو اپنے ہم مسلکوں کا حشر۔ تمھارا نبی بھی ہم پر غلبہ کے خواب دیکھتا ہے۔ اگر یہ سچا ہوتا تو خدا ایرانی مشرکوں کو رومی توحید پرستوں پر کیوں غلبہ عطا کرتا۔ دیکھو رومیوں کے پاؤں کسی جگہ ٹکنے میں نہیں آ رہے ہیں اور ایرانی فوجیں ان کے ملک میں گھسی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں کا حال بھی یہی ہو گا کہ کہیں ان کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔ مسلمانوں کی ہمدردیاں چونکہ عیسائیوں کے ساتھ تھیں، اس لیے وہ شرمندہ ہو کر رہ جاتے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ اس موقع پر سورۂ روم کی آیات نازل ہوئیں:

الٓـمّٓ. غُـلِبَـتِ الـرُّوۡمُ. فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَهُـمۡ مِّـنۡ بَـعۡـدِ غَـلَبِهِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ. فِیۡ بِـضۡـعِ سِـنِیۡـنَ. لِلّٰهِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡ بَـعۡـدُ. وَیَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ. بِنَصۡرِ اللّٰهِ. یَنۡصُرُ مَنۡ یَّشَآءُ. وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ. وَعۡـدَ الـلّٰهِ. لَا یُخۡلِفُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ. (الروم ۳۰: ۱-۶)

”یہ سورۂ الٓم ہے۔ رومی پاس کے علاقے میں مغلوب ہوئے اور وہ اپنی مغلوبیت کے بعد عنقریب ـــــ چند سالوں میں ـــــ غالب آ جائیں گے۔ اللہ ہی کے حکم سے ہوا جو پہلے ہوا اور اللہ ہی کے حکم سے ہو گا جو بعد میں ہو گا۔ اور اس وقت اہل ایمان مسرور ہوں گے اللہ کی مدد سے۔ وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور غالب و مہربان تو وہی ہے۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے اور

اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن اکثر
لوگ نہیں جانتے۔‘‘

ان آیات میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی کہ ایرانیوں کی کامیابیاں عارضی ہیں۔ بہت جلد حالات پلٹا کھائیں گے اور چند سالوں میں رومی فی الوقت اپنی مغلوبیت کے باوجود ایرانیوں پر غالب آ جائیں گے۔ اس وقت اہل ایمان کے مسرور ہونے کا وقت ہو گا اور مشرکین مکہ اپنا منہ چھپاتے پھریں گے۔

’چند سالوں‘ کے لیے عربی میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ’بِضْعِ سِنِیْنَ‘ ہے۔ اس کا اطلاق نو سال یا اس سے کچھ کم مدت پر ہوتا ہے۔ فی الحقیقت ایسا ہی ہوا اور مدینہ کو ہجرت کے بعد دوسرے سال رومیوں نے ایرانیوں کو مکمل طور پر مغلوب کر لیا۔ اس موقع پر اہل ایمان کے لیے اللہ کی نصرت کی ایسی شانیں ظاہر ہوئیں کہ تین سو کمزور مسلمانوں نے ایک ہزار آہن پوش کفار کو بدر کے میدان میں شکست دے دی۔ اس جنگ میں کفار کے صف اول کے تمام سردار جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں پیش پیش رہتے تھے، مارے گئے۔ اس طرح ہجرت حبشہ کے موقع پر کی گئی پیشین گوئی پوری ہو گئی اور اہل ایمان کو کئی مسرتیں ایک ساتھ حاصل ہوئیں۔

حبشہ سے مہاجرین کی واپسی

حبشہ میں قیام کے کچھ عرصہ بعد ۳۳ مسلمان جن میں سے بعض کی بیویاں بھی ساتھ تھیں، وہاں سے مکہ لوٹ آئے۔ ابن اسحاق کے مطابق ان کی آمد اہل مکہ کے اسلام لانے کی ایک غلط خبر سن کر ہوئی۔ واپس آ کر یہ ایک مخمصہ میں گرفتار ہو گئے کہ شہر میں کس کی ذمہ داری پر داخل ہوں۔ اپنے پہلے گھروں کے دروازے ان پر بند ہو چکے تھے۔ کسی مضبوط شخص کا جوار حاصل کیے بغیر مکہ میں رہنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ بعض مسلمانوں نے اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر دوسرے خانوادوں کا جوار حاصل کیا۔ حضرت عثمان بن مظعون حضرت ولید بن مغیرہ کی پناہ میں آئے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ میں تو ولید کے جوار کے باعث بڑے آرام اور سکون سے ہوں، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمان تکلیفیں اٹھا رہے ہیں تو وہ ولید کے پاس گئے کہ میں آپ کا جوار لوٹاتا ہوں۔ ولید نے کہا: میں نے جوار مسجد میں دیا تھا، اس کو لوٹانا بھی مسجد ہی میں ہو گا۔ چنانچہ حضرت عثمان مسجد میں گئے اور یہ اقرار کرنے کے بعد کہ ولید کا جوار نہایت شریفانہ تھا، اس کو واپس کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ اب اللہ کی پناہ پر اعتماد کروں گا۔

حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد نے ابوطالب کا جوار حاصل کیا جس پر ابولہب بہت تلملایا اور اس جوار کی مخالفت

کی۔ ابوطالب نے جواب دیا کہ ابوسلمہ میرے بھانجے ہیں۔ میں ان کو پناہ دیتا ہوں۔

حبشہ جانے والے باقی مہاجرین وہاں سے دوبارہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے اور اللہ کی راہ میں دو ہجرتوں کا ثواب حاصل کیا۔ شاید تمام امتوں میں یہ شرف صرف امت مسلمہ کو حاصل ہوا ہے کہ پیغمبر کے بعض ساتھیوں نے دو مرتبہ ہجرت کا ثواب کمایا۔

(جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم'' سے انتخاب)

جاوید احمد غامدی

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ میں نے اِس دین کو جس طرح سمجھا ہے، اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دیا ہے۔ یہ اِسی کتاب کا خلاصہ ہے جس میں کتاب کا نفس مضمون اُس کے علمی مباحث اور اُن کے استدلالات سے الگ کر کے سادہ طریقے پر پیش کر دیا گیا ہے۔

—— جاوید

قانون معیشت

تزکیۂ معیشت کا جو قانون اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر کی وساطت سے انسانیت کو دیا ہے، اُس کی بنا اِس اصول پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمایش کے لیے بنائی ہے۔ اِس وجہ سے اِس کا نظام اُس نے اِس طرح قائم کیا ہے کہ یہاں سب لوگ ایک دوسرے کے محتاج اور محتاج الیہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔ اِس دنیا میں اعلیٰ سے اعلیٰ شخصیتیں بھی اپنی ضرورتوں کے لیے دوسروں کی طرف رجوع کی محتاج ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ انسانوں کی طرف بھی اِن ضرورتوں کے لیے رجوع کیا جاتا ہے۔ یہاں ہر شخص کا ایک کردار ہے اور کوئی بھی دوسروں سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ عالم کے پروردگار نے یہاں ہر شخص کی ذہانت، صلاحیت، ذوق ورجحان اور ذرائع و وسائل میں بڑا تفاوت رکھا ہے۔ چنانچہ اِس تفاوت کے نتیجے میں جو معاشرہ وجود میں آتا ہے، اُس میں اگر ایک طرف وہ عالم اور حکیم پیدا ہوتے ہیں جن کی دانش سے دنیا روشنی حاصل کرتی ہے؛ وہ مصنف پیدا ہوتے ہیں جن کا قلم لفظ و معنی کے رشتوں کو حیات ابدی عطا کرتا ہے؛ وہ محقق پیدا ہوتے ہیں جن کے نوادر تحقیق پر زمانہ داد دیتا ہے؛ وہ لیڈر پیدا ہوتے ہیں جن کی تدبیر وسیاست سے حیات اجتماعی کے عقدے کھلتے ہیں؛ وہ مصلح پیدا ہوتے ہیں جن کی سعی و جہد سے انسانیت خود اپنا شعور حاصل کرتی ہے اور وہ حکمران پیدا ہوتے ہیں جن کا عزم و استقلال تاریخ کا رخ

بدل دیتا ہے تو دوسری طرف وہ مزدور اور دہقان اور وہ خادم اور قلی اور خاک روب بھی پیدا ہوتے ہیں جن کی محنت سے کلیں معجزے دکھاتی، مٹی سونا اگلتی، چولھے لذت کام ودہن کا سامان پیدا کرتے، گھر چاندی کی طرح چمکتے، راستے پاؤں لینے کے لیے بے تاب نظر آتے، عمارتیں آسمان کی خبر لاتی اور غلاظتیں صبح دم اپنا بستر سمیٹ لیتی ہیں۔

اِس فرق مراتب کے ساتھ دنیا کو پیدا کر کے عالم کا پروردگار یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ اعلیٰ وادنیٰ، باہمی احترام اور باہم دگر تعاون سے صالح معاشرت اور صالح تمدن وجود میں لاتے ہیں یا ایک دوسرے کے خلاف اپنی شرارتوں اور حماقتوں سے اِس عالم کو سراسر فساد بنا دینے کی سعی میں مصروف ہو جاتے ہیں، اور اِس طرح دنیا میں بھی رسوا ہوتے اور آخرت میں بھی اُس کے عذاب کے مستحق ٹھیرتے ہیں۔

انسان کی یہی آزمایش ہے جس میں پورا اترنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے اُس کی رہنمائی فرمائی اور معاشی عمل میں اُس کے تزکیہ وتطہیر کے لیے اُسے اپنا ایک قانون دیا ہے۔

یہ قانون درج ذیل ہے:

۱۔ مسلمان زکوٰۃ ادا کر دیں تو اُن کا وہ مال جس کے وہ جائز طریقوں سے مالک ہوئے ہیں، اللہ ورسول کی طرف سے مقرر کسی حق کے بغیر اُن سے چھینا نہیں جا سکتا، یہاں تک کہ اُن کی ریاست اِس زکوٰۃ کے علاوہ اپنے مسلمان شہریوں پر اُن کی رضامندی کے بغیر کسی نوعیت کا کوئی ٹیکس بھی عائد نہیں کر سکتی۔

۲۔ وہ تمام اموال اور املاک جو کسی فرد کی ملکیت نہیں ہیں یا نہیں ہو سکتے، اُنھیں ریاست ہی کی ملکیت میں رہنا چاہیے تاکہ قوم کی یہ دولت دولت مندوں ہی میں گردش نہ کرے اور اِس کا فائدہ وہ لوگ بھی اٹھائیں جو اپنی ضرورتوں کے لیے دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں۔ اِسی طرح نظم اجتماعی سے متعلق بعض دوسری ذمہ داریاں بھی اِس سے پوری کی جا سکیں۔

۳۔ دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانا ممنوع ہے۔ سود اور جوا اِس سلسلے کے بدترین جرائم ہیں۔ اِن کے علاوہ دوسرے تمام معاشی معاملات کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ بھی اِسی اصول کی روشنی میں کرنا چاہیے۔

۴۔ لین دین، قرض، وصیت اور اِس طرح کے دوسرے مالی امور میں تحریر وشہادت کا اہتمام ضروری ہے۔ اِس سے بے پروائی بعض اوقات بڑے اخلاقی فساد کا باعث بن جاتی ہے۔

اِس کے احکام یہ ہیں:

قرض کا لین دین ایک خاص مدت کے لیے ہو تو ضروری ہے کہ اُس کی دستاویز لکھ لی جائے۔

یہ دستاویز دونوں پارٹیوں کی موجودگی میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

دستاویز لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہو گی۔ وہ دستاویز میں اعتراف کرے گا کہ میں فلاں بن فلاں کا اتنے کا قرض دار ہوں۔

اگر یہ شخص کم عقل ہو یا ضعیف ہو یا دستاویز وغیرہ لکھنے لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اُس کے ولی یا وکیل کو سچائی اور انصاف کے ساتھ یہ دستاویز لکھانی چاہیے۔

اِس پر دو مسلمان مردوں کی گواہی ثبت کی جائے جو میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے اور پسندیدہ اخلاق و عمل کے، ثقہ، معتبر اور ایمان دار ہوں۔

اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اِس لیے ہے کہ گھر میں رہنے والی یہ بی بی اگر عدالت کے ماحول میں گھبراہٹ میں مبتلا ہو تو گواہی کو ابہام و اضطراب سے بچانے کے لیے ایک دوسری بی بی اُس کے لیے سہارا بن جائے۔

جو لوگ کسی دستاویز کے گواہوں میں شامل ہو چکے ہوں، گواہی کے موقع پر اُنھیں گواہی سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

دست گرداں لین دین کے لیے تحریر و کتابت کی پابندی نہیں ہے۔ ہاں، اگر کوئی اہمیت رکھنے والی خرید و فروخت ہوئی ہے تو اُس پر گواہ بنا لینا چاہیے تاکہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اُس کا تصفیہ ہو سکے۔

نزاع پیدا ہو جانے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لیے جائز نہیں ہے۔

آدمی سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ملے تو قرض کا معاملہ رہن قبضہ کرانے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ رہن کی اجازت اُسی وقت تک ہے، جب تک قرض دینے والے کے لیے اطمینان کی صورت پیدا نہیں ہو جاتی۔ یہ صورت پیدا ہو جائے تو قرض پر گواہی کرا کے رہن رکھی ہوئی چیز لازماً واپس کر دینی چاہیے۔

کسی شخص کی موت آ جائے اور اپنے مال سے متعلق اُس کو کوئی وصیت کرنی ہو تو اپنے مسلمان بھائیوں میں سے دو ثقہ آدمیوں کو اُسے بھی اپنی اِس وصیت پر گواہ بنا لینا چاہیے۔

موت کا یہ مرحلہ اگر کسی شخص کو سفر میں پیش آئے اور گواہ بنانے کے لیے وہاں دو مسلمان میسر نہ ہوں تو مجبوری کی حالت میں وہ دو غیر مسلموں کو بھی گواہ بنا سکتا ہے۔

مسلمانوں میں سے جن دو آدمیوں کو گواہی کے لیے منتخب کیا جائے، اُن کے بارے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ کسی شخص کی جانب داری میں وہ اپنی گواہی میں کوئی ردوبدل کر دیں گے تو اِس کے سد باب کی غرض سے یہ تدبیر کی جا سکتی

ہے کہ کسی نماز کے بعد اُنھیں مسجد میں روک لیا جائے اور اُن سے اللہ کے نام پر قسم لی جائے کہ اپنے کسی دنیوی فائدے کے لیے یا کسی کی جانب داری میں، خواہ وہ اُن کا کوئی قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنی گواہی میں کوئی تبدیلی نہ کریں گے اور اگر کریں گے تو گناہ گار ٹھیریں گے۔

گواہوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ گواہی خدا کی گواہی ہے، لہٰذا اِس میں کوئی ادنیٰ خیانت بھی اگر اُن سے صادر ہوئی تو وہ نہ صرف بندوں کے، بلکہ خدا کے بھی خائن قرار پائیں گے۔

اِس کے باوجود اگر یہ بات علم میں آجائے کہ گواہوں نے وصیت کرنے والے کی وصیت کے خلاف کسی کے ساتھ جانب داری برتی ہے یا کسی کی حق تلفی کی ہے تو جن کی حق تلفی ہوئی ہے، اُن میں سے دو آدمی اٹھ کر قسم کھائیں گے کہ ہم اِن اولیٰ بالشہادت گواہوں سے زیادہ سچے ہیں۔ ہم نے اِس معاملے میں حق سے کوئی تجاوز نہیں کیا اور ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ایسا کیا ہو تو خدا کے حضور میں ظالم قرار پائیں۔

گواہوں پر اِس مزید احتساب کا فائدہ یہ ہے کہ اِس کے خیال سے، توقع ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے۔ ورنہ اُنھیں ڈر ہو گا کہ اُنھوں نے اگر کسی بدعنوانی کا ارتکاب کیا تو اُن کی قسمیں دوسروں کی قسموں سے باطل قرار پائیں گی اور اولیٰ بالشہادت ہونے کے باوجود اُن کی گواہی رد ہو جائے گی۔

۵۔ ہر مسلمان کی دولت اُس کے مرنے کے بعد درج ذیل طریقے سے اُس کے وارثوں میں لازماً تقسیم کر دینی چاہیے:

مرنے والے کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اُس کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا۔ پھر کوئی وصیت اگر اُس نے کی ہو تو وہ پوری کی جائے گی۔ اِس کے بعد وراثت تقسیم ہو گی۔

وارث کے حق میں وصیت نہیں ہو سکتی، الّا یہ کہ اُس کے حالات یا اُس کی کوئی خدمت یا ضرورت کسی خاص صورت حال میں اِس کا تقاضا کرے۔ اِسی طرح کوئی ایسا شخص کسی مرنے والے کا وارث نہیں ہو سکتا جس نے اُس کے ساتھ قرابت کی بنیاد ہی اپنے قول و فعل سے باقی نہ رہنے دی ہو۔

والدین اور بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد ترکے کی وارث میت کی اولاد ہے۔ مرنے والے نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اُس کی اولاد میں دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہی ہوں تو اُنھیں بچے ہوئے ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا۔ ایک ہی لڑکی ہو تو وہ اُس کے نصف کی حق دار ہو گی۔ میت کی اولاد میں صرف لڑکے ہی ہوں تو یہ سارا مال اُن میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اولاد میں لڑکے لڑکیاں، دونوں ہوں تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو گا اور اِس صورت میں بھی

سارا مال اُنھی میں تقسیم کیا جائے گا۔

اولاد کی غیر موجودگی میں میت کے بھائی بہن اولاد کے قائم مقام ہیں۔ والدین اور بیوی یا شوہر موجود ہوں تو اُن کا حصہ دینے کے بعد میت کے وارث یہی ہوں گے۔ ذکور و اناث کے لیے اُن کے حصے اور اُن میں تقسیم وراثت کا طریقہ وہی ہے جو اولاد کے لیے اوپر بیان ہوا ہے۔

میت کے اولاد ہو یا اولاد نہ ہو اور بھائی بہن ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ بھائی بہن بھی نہ ہوں اور تنہا والدین ہی میت کے وارث ہوں تو ترکے کا ایک تہائی ماں اور دو تہائی باپ کا حق ہے۔

مرنے والا مرد ہو اور اُس کی اولاد ہو تو اُس کی بیوی کو ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔ اُس کے اولاد نہ ہو تو وہ ایک چوتھائی ترکے کی حق دار ہو گی۔ میت عورت ہو اور اُس کی اولاد نہ ہو تو نصف ترکہ اُس کے شوہر کا ہے، اور اگر اُس کے اولاد ہو تو شوہر کو چوتھائی ترکہ ملے گا۔

اِن وارثوں کی عدم موجودگی میں مرنے والا اگر چاہے تو کسی کو ترکے کا وارث بنا سکتا ہے۔ جس شخص کو وارث بنایا گیا ہو، وہ اگر رشتہ دار ہو اور اُس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو چھٹا حصہ اور ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو ایک تہائی اُنھیں دینے کے بعد باقی ۶/۵ یا دو تہائی اُسے ملے گا۔

یہ تقسیم جس بنیاد پر قائم ہے، وہ قرابت نافعہ ہے اور حصوں میں فرق کی وجہ بھی اُن کے پانے والوں کی طرف سے مرنے والے کے لیے اُن کی منفعت کا کم یا زیادہ ہونا ہی ہے۔ لڑکیوں کی منفعت چونکہ شادی کے بعد اُن کے شوہر کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح بیوی شوہر کو رفاقت مہیا کرتی ہے، لیکن شوہر رفاقت کے ساتھ اُس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری بھی اٹھاتا ہے۔ اِس لیے لڑکوں کا حصہ لڑکیوں سے اور شوہر کا حصہ بیوی سے دو گنا رکھا گیا ہے۔

طالب محسن

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

مرفوع احادیث میں شرک، تین طلاقوں، ہدہد اور نملہ کی وضاحت

سوال: استمداد اور قربانی و نذر اور پکار (لغیر اللہ استغاثہ)، دفعۃً تین طلاقوں کا تین ہونا، ہدہد اور نملہ کے لیے مرفوع صحیح احادیث بیان کریں۔ (پرویز قادر)

جواب: شرک کی شناعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بیان کی ہے۔ پھر خود قرآن مجید میں بھی یہ موضوع بار بار زیر بحث آیا ہے۔ تینوں چیزیں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، اگر غیر اللہ کے لیے ہوں تو شرک ہیں۔ احادیث میں ان کا ذکر کر کے ان کی شناعت بیان کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی، اس لیے کہ یہ بات خود قرآن مجید میں کئی اسالیب میں بیان کر دی گئی ہے۔ ممکن ہے، کسی روایت میں تصریح کے ساتھ ان کی نفی کی گئی ہو، لیکن معروف روایات میں شرک ہی کی تردید یا شناعت بیان ہوئی ہے۔

اسی طرح ہدہد اور نملہ کے بارے میں بعض صحابہ کے اقوال تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں نقل ہوئے ہیں۔ سر دست مجھے کوئی مرفوع حدیث نہیں ملی۔

تین طلاقوں کا ایک طلاق ہونا ایک فقہی بحث ہے، اس میں استدلال کا مدار کن روایات پر ہے، اس کا خلاصہ ابن رشد نے اپنی کتاب ''بدایۃ المجتہد'' میں بخوبی کیا ہے۔ میں اسے آپ کے لیے نقل کر دیتا ہوں:

''ان کے استدلال کی بنیاد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث پر بھی ہے۔ جس کی تخریج امام مسلم (رقم ۱۴۷۲) اور امام بخاری نے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حضرت ابوبکر کے دور میں اور خلافت عمر کے دو سالوں میں تین طلاقیں ایک ہی قرار دی جاتی تھیں۔ حضرت عمر نے تینوں کو نافذ کر دیا۔ ان حضرات کے استدلال کی بنیاد ابن اسحاق کی روایت پر بھی ہے جو انھوں نے عکرمہ سے بواسطۂ ابن عباس بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیں اور اس پر انھیں شدید قلق ہوا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: تم نے طلاق کس طرح دی ہے؟ انھوں نے عرض کیا: میں نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں۔ آپ نے فرمایا: وہ تو ایک طلاق ہے، تم اس سے رجوع کر لو۔ (ابوداؤد، رقم ۲۲۰۶؛ ابن ماجہ، رقم ۲۰۵۱)

جمہور کی رائے (ایک وقت میں تین طلاقوں) کی حمایت کرنے والے کہتے ہیں کہ صحیحین میں موجود حدیث ابن عباس کی روایت ان کے اصحاب میں سے طاؤس نے کی ہے، جبکہ ان کے بیش تر اصحاب نے جن میں سعید بن جبیر، مجاہد، عطا اور عمرو بن دینار رضی اللہ عنہم ہیں اور ان کے علاوہ ایک جماعت نے تین طلاقوں کے واقع ہو جانے کا قول نقل کیا ہے اور ابن اسحاق کی حدیث وہم ہے۔ ثقہ راویوں کے الفاظ تو یہ ہیں کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو حتمی طلاق دی تھی۔ اس میں تین کے الفاظ نہیں ہیں۔'' (۴۶/۲)

احادیث اور دین کے بعض اجزا

سوال: کیا پانچ نمازیں، وضو میں پاؤں دھونا، معجزات، تقدیر، ارضی قبر کے عالم برزخ ہونے پر ایمان، یتیم پوتے کی میراث کا نہ ہونا اور ہفت قرآن، وحی خفی کی رو سے واجب ہیں۔ کیا تجسیم باری تعالیٰ کی تاویل ہوگی؟ (پرویز قادر)

جواب: پہلی دونوں چیزوں کا ماخذ سنت متواترہ ہے۔ وضو میں اختلاف آیت قرآنی کی تاویل میں اختلاف سے پیدا ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ساری امت اس بات پر متفق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں پاؤں دھوتے تھے۔

معجزات اور تقدیر اللہ پر ایمان کے لوازم میں سے ہیں۔ حدیث میں جو معجزات بیان ہوئے ہیں، ان پر اگر سنداً

کوئی اعتراض نہیں ہے تو ماننے میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری زندگی، موت، والدین، بہن بھائی اور اس طرح متعدد چیزیں جن میں ہماری سعی کا کوئی تعلق نہیں ہے، خود مقرر کر رکھی ہیں، اسے ماننا اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک ماننے کا نتیجہ ہے۔ یہی بات احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ جن حدیثوں سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا نیک و بد ہونا بھی مقدر ہے تو وہ راویوں کے سوءفہم کا نتیجہ ہے۔ قرآن مجید میں بیان کیا گیا قانون آزمایش اس تصور کی نفی کرنے کے لیے کافی ہے۔

ارضی قبر کو عالم برزخ قرار دینے کی وجہ حدیث نہیں ہے، حدیث کا فہم ہے۔ قبر کی تعبیر عالم برزخ کے لیے اختیار کرنا زبان کے عمومی استعمالات میں بالکل درست ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ قبر ہی عالم برزخ ہے، سخن ناشناسی ہے۔

مجھے نہیں معلوم کس روایت میں تجسیم باری تعالیٰ بیان ہوئی ہے۔ جس طرح قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور چہرے کے الفاظ ہیں۔ اور عرش پر استوا کی تعبیر اختیار کی گئی ہے، اسی طرح کی تعبیرات احادیث میں بھی ہیں۔ ان سے تجسیم کا نتیجہ نکالا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ الفاظ معنوی پہلو سے استعمال ہوئے ہیں۔ خود قرآن مجید ہی میں یہ بات بیان ہوگئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔ اس ارشاد سے واضح ہے کہ اوپر مذکور تعبیرات ابلاغ مدعا کے لیے ہیں، ان کا لفظی اطلاق درست نہیں ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف

سوال: کیا فروعی اور فہم و اطلاق کے مسائل میں نبی کریم کے اجتہادات، مشورہ اور سوچ سے اختلاف جائز ہے؟ (پرویز قادر)

جواب: ہرگز جائز نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنا ایمان کی نفی کی علامت ہے اور حبط اعمال کا باعث ہوگا۔ اگر کوئی شخص روایت و درایت کے اصول پر کسی بات کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو درست نہیں مانتا تو یہ دراصل کسی محدث سے اختلاف ہے، اسے حضور سے اختلاف قرار دینا سراسر زیادتی ہے۔

ارتقا، معراج اور قرآن

سوال: ارتقا قرآن مجید کی کس آیت میں بیان ہوا ہے۔ مزید براں یہ بھی بتایے کہ کس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معراج ایک خواب تھا؟ (سعد فاروق)

جواب: ارتقا کے نقطۂ نظر کی اصل یہ ہے کہ زندگی انتہائی سادہ خلیاتی وجود سے شروع ہوئی اور بتدریج اس نے پیچیدہ جان داروں کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ ان کے نزدیک پہلا انسان اس ابتدائی خلیاتی وجود کی طرح مٹی سے نمودار نہیں ہوا تھا، بلکہ وہ کسی والدین کی اولاد تھا جو اس انسان سے کم تر تھے، لیکن اس کے کافی قریب تھے۔

قرآن مجید کے نزدیک پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام تھے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں براہ راست مٹی سے پیدا کیا تھا، یعنی ان کے کوئی والدین نہیں تھے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں یہ دونوں باتیں یکجا بیان ہوئی ہیں۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ. (۳:۵۹)

''عیسیٰ کی مثال، اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے۔ اس کو مٹی سے بنایا، پھر اس کو کہا کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔''

یہ آیت اصل میں یہ بتا رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ ولادت میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان سے پہلے قادر مطلق نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے بغیر ماں باپ کے پیدا کر دیا تھا۔ چونکہ اس میں والدین کا ہونا اور نہ ہونا اصل موضوع ہے، اس لیے یہ آیت اس بات پر قطعیت کی مہر لگا دیتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے والدین نہیں تھے۔

انسان کی تخلیق کے ضمن میں دوسری اہم آیت سورۂ سجدہ کی ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں:

الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ. ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَہٗ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّہِیۡنٍ. ثُمَّ سَوّٰىہُ وَنَفَخَ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡئِدَۃَ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ. (۳۲:۷-۹)

''جس نے جو چیز بنائی ہے، خوب بنائی ہے، اس نے انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا۔ پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔ پھر اس کے نوک پلک سنوارے اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو۔''

اس آیت میں کچھ مراحل بیان ہوئے ہیں۔ استاد محترم کی رائے یہ ہے کہ اس آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ ایک

طویل زمانہ ایسا گزرا جس میں انسان براہ راست زمین سے پیدا ہوتے رہے۔ پھر ان انسانوں میں یہ صلاحیت پیدا کر دی گئی کہ وہ اپنی نسل آگے بڑھا سکیں۔ پھر ایک زمانے میں زمین سے پیدا ہونے والے ایک جوڑے کو جس میں نسل آگے بڑھانے کی صلاحیت بھی تھی، منتخب کیا گیا۔ اس میں روح پھونکی گئی۔ تمام نسل انسان اسی جوڑے کی اولاد ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سائنس دانوں کو جدید انسان کے علاوہ انسان سے مشابہ جو بھی آثار ملے ہیں، وہ درحقیقت پہلے ادوار کے انسانوں کے ہیں۔ اس کے لیے وہ ارتقا کا لفظ بھی بولتے ہیں۔

معراج کا واقعہ قرآن مجید کی سورۂ بنی اسرائیل میں بیان ہوا ہے، بلکہ سورہ کا آغاز ہی اس کے بیان پر مبنی ہے۔ اسی سورہ میں آگے جا کر اس واقعے کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے اسے نہ ماننے والوں کے لیے فتنہ بنا دیا۔ آیت کے الفاظ ہیں:

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْ يَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ.

(۱۷:۶۰)

''اور یاد کرو جب ہم نے تم سے کہا تھا کہ تمھارے رب نے لوگوں کو گھیرے میں لے لیا اور وہ رویا جو ہم نے تم کو دکھائی اس کو ہم نے لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ ہی بنا دیا۔''

اس آیت میں معراج کے واقعے کے لیے رویا کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس رویا سے مسجد اقصیٰ کی طرف سفر ہی مراد ہے۔ البتہ رویا کے لفظ کے معنی کی تاویل کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک رویا کا لفظ ایک ہی معنی کے لیے بولا جاتا ہے اور وہ وہی ہے جس کے لیے ہم خواب کا لفظ بولتے ہیں۔ البتہ ہمارے خواب اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ پیغمبروں کو رویا میں جو کچھ نظر آتا ہے، وہ حقیقت ہوتی ہے، اس لیے کہ انھیں شیطان کی ہر دراندازی سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ بہر حال یہ آیت اس بات پر نص قطعی ہے کہ معراج جسمانی نہیں تھی۔

کرسی پر نماز

سوال: کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے کیا سجدے کے لیے اتنا کافی ہے کہ آدمی تھوڑا سا جھک جائے یا کوئی سرہانا یا سخت چیز رکھ کر اس پر باقاعدہ سر رکھنا چاہیے؟ (سعد فاروق)

جواب: نماز کی اصل ہیئت کے جس قدر قریب ہوں، اتنا ہی اچھا ہے۔ بیماری اور تکلیف میں رخصت کا مطلب صرف یہ ہے کہ نماز کے وقت پر ہر حال میں نماز پڑھی جائے اور کسی مجبوری کو اس راہ میں حائل نہ ہونے دیا جائے۔ ہیئت میں رخصت کتنی ہے، یہ بات طے نہیں کی گئی۔ نمازی کی معذوری، حالات اور مزاج کے فرق کی وجہ سے یہ اسی پر چھوڑنا بہتر ہے کہ وہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔ آپ والی مثال لے لیں کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والا کہاں ہے: گھر میں ہے؟ مسجد میں ہے؟ سفر میں ہے؟ کسی کے ہاں مہمان ہے؟ کتنا جھک سکتا ہے؟ کرسی کون سی دستیاب ہے؟ مراد یہ ہے کہ ہر ہیئت اور حالات میں نماز کی اصل ہیئت سے قربت کی صورت بدل جائے گی۔ چنانچہ نمازی، اس کی بیماری اور دستیاب حالات تینوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ ہوگا کہ نماز ادا کرنے کی بہتر صورت کیا ہوگی۔

حدیث قرطاس

سوال: بخاری میں ایک روایت ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے کاغذ اور قلم منگوایا تھا تاکہ آپ اس میں امت کے لیے کچھ لکھ دیں، مگر کچھ لوگوں نے کہا: آپ بیمار ہیں۔ ہمارے پاس قرآن ہے، لہٰذا ضروری نہیں کہ آپ سے کچھ لکھوایا جائے۔ آپ بتایے کیا یہ واقعہ ممکن ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے کچھ کہیں اور صحابہ اس کی تعمیل نہ کریں؟ (سعد فاروق)

جواب: اس روایت کے حوالے سے دو رائیں اختیار کی جا سکتی ہیں: ایک یہ کہ اس واقعے ہی کو سرے سے نہ مانا جائے۔ اس کے قرائن بھی اس روایت میں موجود ہیں۔ سب سے قوی قرینہ یہ ہے کہ کاغذ اور قلم نہ لانے کی بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کی جا رہی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو مطعون کرنا ایک زمانے میں باقاعدہ مسئلہ رہا ہے۔ ممکن ہے یہ واقعہ بھی اسی جذبے کے تحت تخلیق کیا گیا ہو۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وفات سے تین چار دن پہلے پیش آیا، اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم واقعۃً کوئی چیز لکھوانا چاہتے تھے تو آپ وہ چیز دوبارہ کہہ کر لکھوا سکتے تھے۔ تیسرا قرینہ یہ ہے کہ اس روایت کے راویوں میں ابن شہاب بھی ہیں۔ حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں وہ روایات جن میں ان کی کوئی نہ کوئی خرابی سامنے آتی ہو، ان کی سند میں بالعموم یہ موجود ہوتے ہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اس واقعے کو درست مان لیا جائے۔ شارحین نے اس واقعے کو درست مانتے ہوئے اس

اعتراض کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مانی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ کچھ صحابہ نے یہ رائے قائم کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات ان کی طرف سے جاری کردہ کوئی امر نہیں تھا، بلکہ محض ایک مشورہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کو افاقہ بھی ہوا تو آپ نے یہ خواہش دوبارہ نہیں کی۔

میں ذاتی طور پر یہی محسوس کرتا ہوں کہ یہ واقعہ قابل قبول نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جہنم کہاں ہے؟

سوال: کیا جہنم زمین پر ہے؟ (زبیر شیخ)

جواب: قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے حتمی طور پر معلوم ہو کہ جہنم کہاں ہوگی۔ البتہ قرآن مجید سے ہمیں احوال قیامت کے ضمن میں جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان کی روشنی میں ہم ایک اندازہ قائم کر سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین و آسمان زبردست تباہی سے گزریں گے۔ ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اسی طرح لپیٹ دیا جائے گا جیسے کاغذ رول کیا جاتا ہے۔ ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان زمین و آسمان کو نئے زمین و آسمان سے بدل دیا جائے گا۔

اس تفصیل سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ جہنم اور جنت اسی نئی دنیا میں ہوں گے۔

محمد رفیع مفتی

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

معجزے کا مقصد

سوال: کیا تمام نبیوں اور رسولوں کو معجزے عطا کیے گئے تھے؟ کیا معجزہ اللہ کے قانون فطرت سے متصادم نہیں ہوتا؟ کیا قرآن مجید میں یہ بات موجود ہے کہ اللہ اپنی سنت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا؟

(آصف بن خلیل و قمر اقبال)

جواب: یہ بات تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں اور نبیوں کو معجزے دیے ہیں، کیونکہ بہت سے انبیا ایسے ہیں جن کے بارے میں ہمیں بالکل کوئی معلومات نہیں دی گئیں۔ معجزہ یقیناً اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے اپنے جاری کردہ قانون ہی کو توڑتا ہے اور معجزہ دیا بھی اسی لیے جاتا ہے کہ وہ جاری قانون کو توڑ کر یہ بتا دے کہ جس شخص کے ہاتھ سے یہ واقعہ سرزد ہو رہا ہے، اس کے پیچھے اس کائنات کا مالک کھڑا ہے۔ خدا نے قرآن مجید میں کہیں بھی ایسی کوئی بات نہیں کی کہ وہ کائنات میں اپنے جاری قانون کو ہرگز نہیں توڑے گا۔ اس ضمن میں جن آیات سے استدلال کیا جاتا ہے، ان کا قوانین فطرت سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے، بلکہ وہ

آیات رسولوں کے بارے میں اللہ کی مستقل سنت سے متعلق ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا. مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا. سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا.

(الاحزاب ۳۳: ۶۰-۶۲)

''یہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو مدینہ میں سنسنی پھیلانے والے ہیں، اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم تم کو ان پر اکسا دیں گے، پھر وہ تمھارے ساتھ رہنے کا بہت ہی کم موقع پائیں گے۔ ان پر پھٹکار ہوگی، جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے اور بے دریغ قتل کیے جائیں گے۔ یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے ہو گزرے ہیں اور تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔''

یہ رسولوں کے مخالفین کے بارے میں اللہ کی سنت ہے، نہ کہ قوانین فطرت کے بارے میں۔

ترجمۂ قرآن

سوال: میں نے بعض لوگوں سے یہ سنا ہے کہ قرآن کا پہلا ترجمہ فارسی میں ہوا تھا اور پھر اسی فارسی ترجمے سے باقی تمام ترجموں میں رہنمائی لی گئی، جس کی وجہ سے ایرانیوں کے خیالات اور ان کے عقائد قرآن کے اُن ترجموں میں شامل ہو گئے ہیں، چنانچہ یہ ترجمے قابل اعتبار نہیں ہیں، خصوصاً جبکہ ہم لوگ عربی زبان سے بھی ناواقف ہیں۔ کیا یہ بات آپ کے خیال میں درست ہے؟

(آصف بن خلیل وقمر اقبال)

جواب: ترجموں کے حوالے سے آپ نے جو بات لکھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس عالم نے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا، وہ تو کچھ عربی جانتا تھا، چنانچہ اس نے عربی قرآن کا فارسی میں ترجمہ کر لیا، لیکن جن لوگوں نے قرآن کا ترجمہ مثلاً اردو میں کیا ہے، وہ عربی کوئی خاص نہیں جانتے تھے، البتہ وہ فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ چنانچہ وہ فارسی ترجمے ہی کی مدد سے اردو میں قرآن کا ترجمہ کرنے پر مجبور تھے۔ سبحان اللہ، یہ نکتہ بہت بودا ہے۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے اردو ترجمے کو دیکھیے، وہ ایک بے مثال ترجمہ ہے۔ کوئی شخص بھی یہ بات نہیں مان سکتا کہ مسلمان

امت میں قرآن کا ترجمہ عربی زبان سے ناواقف لوگوں نے کیا ہے اور جو عربی زبان جانتے تھے، انھوں نے ایسے ترجمے اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے دیے اور خود اس ضمن میں کوئی کام نہ کیا۔

اس طرح کے اشکالات عموماً وہ لوگ پیدا کرتے ہیں جو اصل میں خود عربی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں۔

فرشتوں کی حقیقت

سوال: کیا فرشتے اللہ کی طاقتوں میں سے ایک طاقت ہیں یا وہ ایک نوری مخلوق ہیں جو اپنا جسمانی وجود بھی رکھتی ہے جو انسانی روپ یا کسی بھی روپ میں ظاہر ہو سکتی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کی صفاتی طاقتیں ہیں جنھیں مختلف فرشتوں کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے؟ (آصف بن خلیل وقمر اقبال)

جواب: فرشتے اپنا تشخص رکھتے ہیں۔ وہ کائناتی قوتیں نہیں ہیں، نہ وہ خدا کی طاقتوں کے نام ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے بارے میں جس طرح کلام کیا گیا ہے، وہ کلام بتاتا ہے کہ وہ اپنا ایک تشخص رکھتے ہیں۔ ارشاد باری ہے:

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا. (النساء۴:۱۷۲)

''اور مسیح کو اللہ کا بندہ بننے سے ہرگز عار نہ ہوگا اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہوگا اور جو اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو اللہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ مقرب فرشتے بھی مسیح علیہ السلام کی طرح کسی کام سے عار محسوس کرنے کی اور تکبر کرنے کی صلاحیت بہر حال رکھتے ہیں اور وہ بھی مسیح کی طرح اللہ کا بندہ بننے اور اس کی عبادت کرنے کے مکلّف ہیں۔ اس طرح کی اور بھی بے شمار آیات ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے اپنا باقاعدہ تشخص رکھتے ہیں۔

ہم فرشتوں کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتے، بس اتنا معلوم ہے کہ وہ اللہ کی ایک مخلوق ہے۔ ان کے ذمے جو کام ہوتے ہیں، انھیں وہ بڑی فرماں برداری سے بجا لاتے ہیں۔

ہمیں اس بات میں کیوں کوئی اشکال ہو کہ فرشتے انسانی روپ دھار سکتے ہیں یا نہیں، اگر قرآن ایسی کوئی بات کرتا ہے کہ وہ انسانی روپ میں آسکتے ہیں یا آئے ہیں تو ہم تہ دل سے اسے مانیں گے۔ ارشاد باری ہے:

فَاَرۡسَلۡنَآ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا، قَالَتۡ اِنِّيۡٓ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡكَ اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا، قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا. (مریم ۱۹: ۱۷-۱۹)

''تو ہم نے اس (مریم) کے پاس اپنی روح کو بھیجا، جو اس کے سامنے ایک کامل بشر کی صورت میں نمودار ہوئی۔ وہ بولی کہ اگر تم کوئی خدا ترس آدمی ہو تو میں تم سے خدا رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔ اس نے کہا کہ میں تو تمھارے رب ہی کا فرستادہ ہوں تاکہ تمھیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔''

یہ آیت بتاتی ہے کہ خدا کی وہ فرستادہ روح بشر کی صورت دھار کر مریم کے پاس آئی تھی۔ اسی روح کو قرآن میں دوسری جگہوں پر روح الامین، روح القدس اور الروح کہا گیا ہے اور قرآن ہی کے دوسرے مقامات سے پتا چلتا ہے کہ یہ روح جبریل علیہ السلام ہیں۔

وہ فرشتے جو ابراہیم علیہ السلام کے پاس مہمانوں کی صورت میں آئے تھے، وہ بھی انسانی روپ ہی میں تھے، جبھی تو وہ انھیں پہچان نہ سکے تھے اور ان کے لیے بھنا ہوا گوشت لا کر رکھ دیا۔ پھر جب انھوں نے وہ نہیں کھایا تو آپ نے ان سے یہ کہا کہ آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں۔

اس طرح کے بعض اور مقام بھی ہیں، جن سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے انسانی روپ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد اس سے انکار کی کوئی وجہ ہی موجود نہیں ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام

سوال: کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعی بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے یا حضرت مریم کی شادی ہوئی تھی اور اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا اور وہ قیامت سے پہلے دنیا میں دوبارہ واپس آئیں گے یا ان کی طبعی وفات ہوئی تھی؟

(آصف بن خلیل و قمر اقبال)

جواب: عیسیٰ علیہ السلام یقیناً بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ، خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ، اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ. (آل عمران ۳: ۵۹-۶۰)

”بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے، اس کو مٹی سے بنایا، پھر اس کو امر کیا کہ تو ہو جا تو وہ ہو گیا۔
یہی بات تمھارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔“

یہ آیت واضح طور پر یہ بتا رہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش کا معاملہ آدم علیہ السلام کی پیدایش کی مثل ہے اور آپ اسی طرح بغیر باپ کے مریم کے پیٹ میں حرف کن سے پیدا کیے گئے تھے، جیسے آدم علیہ السلام بغیر ماں باپ کے مٹی سے حرف کن کے ساتھ پیدا کیے گئے تھے۔ پھر اس کے بعد اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نصیحت بھی کر دی ہے کہ یہی بات حق ہے، لہٰذا اے مخاطب، تم شک کرنے والوں میں نہ بنو۔

عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کا قرآن مجید میں دو مقامات پر ذکر موجود ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا، بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ. (النساء۴: ۱۵۷-۱۵۸)

”انھوں نے اس کو ہرگز قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا۔“

اور فرمایا:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ. (آل عمران۳: ۵۵)

”جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا۔“

ان دونوں آیات سے یہ پتا چلتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے ہرگز قتل نہیں کیا تھا، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے، البتہ اللہ نے انھیں وفات دی تھی اور پھر اللہ نے ان کے بے جان جسم کو یہود کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے اپنے پاس اٹھا لیا تھا۔ چنانچہ یہی بات صحیح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔

اس سب کے باوجود اگر انھیں دنیا میں دوبارہ آنا ہے تو اس میں عقلاً کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ البتہ جن احادیث میں ان کے دنیا میں دوبارہ آنے کا ذکر ہے، خود قرآن مجید ہی کی بعض آیات ان سے متصادم ہیں۔ لہٰذا ان آیات کی روشنی ہی میں ان احادیث کو سمجھنا چاہیے۔

قیامت کا مفہوم

سوال: کیا قیامت کا مطلب دنیا اور کائنات کا خاتمہ ہے یا اس سے مراد وہ وقت اور زمانہ ہے، جب

اللہ تعالیٰ کا نظام، یعنی دین نافذ ہو جائے گا؟ اس سلسلے میں قرآن مجید سے کیا بات ثابت ہوتی ہے؟

(آصف بن خلیل و قمر اقبال)

جواب: قرآن مجید کے مطابق قیامت کا واضح طور پر صرف اور صرف یہی مطلب ہے کہ دنیا میں پیدا ہونے والے ہر آدمی کو مرنا ہے، پھر ایک دن یہ زمین شدید زلزلوں کی وجہ سے بالکل ہموار ہو جائے گی اور انسانوں کی یہ دنیا ختم ہو جائے گی، یہ کائنات بھی توڑ پھوڑ دی جائے گی۔ پھر نئی دنیا وجود میں آئے گی، لوگ مر کر ہڈیاں ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے اور میدان حشر میں حساب کتاب کے لیے اکٹھے کیے جائیں گے، سب لوگوں کا حساب کتاب ہو گا اور پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت یا دوزخ میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ سب کچھ قرآن کی صریح آیات سے ثابت ہے۔ ذیل میں ان درج بالا باتوں میں سے ہر ایک سے متعلق آیات پیش کی جاتی ہیں۔

دنیا میں پیدا ہونے والے ہر آدمی کو مرنا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ. (آل عمران ۳:۱۸۵)

''ہر انسان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔''

پھر ایک دن یہ زمین شدید زلزلوں کی وجہ سے بالکل ہموار ہو جائے گی اور انسانوں کی یہ دنیا ختم ہو جائے گی:

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا. (الزلزال ۹۹:۱-۲)

''جب زمین پوری شدت کے ساتھ ہلا دی جائے گی اور وہ اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی۔''

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ، وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ. (الانشقاق ۸۴:۳-۴)

''اور جب زمین تان دی جائے گی اور وہ اپنے اندر کی چیزیں باہر ڈال کر فارغ ہو جائے گی۔''

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ. (الرحمٰن ۵۵:۲۶)

''اس زمین پر جو کچھ ہے، وہ سب فانی ہے۔''

یہ کائنات بھی توڑ پھوڑ دی جائے گی:

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ، وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ. (الانفطار ۸۲:۱-۲)

''جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے بکھر جائیں گے۔''

پھر نئی دنیا وجود میں آئے گی:

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ. (ابراہیم ۱۴: ۴۸)

''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان دوسرے آسمان سے۔''

لوگ مر کر ہڈیاں ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے اور میدان حشر میں حساب کتاب کے لیے اکٹھے کیے جائیں گے:

یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ، ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً، قَالُوْا تِلْکَ اِذًا کَرَّةٌ خَاسِرَةٌ، فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ، فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ. (النازعات ۷۹: ۱۱ تا ۱۴)

''پوچھتے ہیں: کیا ہم پھر پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے، کیا جبکہ ہم کھنکھناتی ہڈیاں ہو چکیں گے، کہتے ہیں: یہ لوٹایا جانا تو بڑے ہی خسارے کا ہو گا۔ وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہو گی کہ دفعۃً وہ سب میدان میں آ موجود ہوں گے۔''

سب لوگوں کا حساب کتاب ہو گا:

هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰکُمْ وَالْاَوَّلِیْنَ. (المرسلٰت ۷۷: ۳۸)

''یہ ہے فیصلے کا دن، ہم نے جمع کر لیا ہے تم کو بھی اور اگلوں کو بھی۔''

پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت یا دوزخ میں داخل ہو جائیں گے:

وَتُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَیْبَ فِیْهِ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَ فَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ. (الشوریٰ ۴۲: ۷)

''اور اس دن سے ڈراؤ، جو سب کو اکٹھا کرنے کا دن ہو گا، جس کے آنے میں کسی شک کی گنجایش نہیں ہے، (اس دن) ایک گروہ جنت میں داخل ہو گا اور ایک گروہ دوزخ میں۔''

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ، فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ. (البقرہ ۲: ۸۱)

''البتہ جس نے کمائی کوئی بدی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ، هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ.

(البقرہ ۲: ۸۲)

''اور جو ایمان لائے اور انھوں نے بھلے کام کیے تو وہی جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

یہ آیات اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں، اس طرح کی اور بے شمار آیات قرآن میں موجود ہیں، ان

کوکسی ایسے مجازی مفہوم میں لینا ممکن ہی نہیں، جس سے اس کائنات میں کوئی توڑ پھوڑ واقع نہ ہو، لوگ مرکر دوبارہ زندہ نہ ہوں، ان کے اعمال کا حساب کتاب نہ ہو اور وہ اپنے اچھے اعمال کے بدلے میں جنت نہ پائیں اور برے اعمال کے بدلے میں دوزخ کی سزا سے ہم کنار نہ ہوں۔ جن لوگوں نے انھیں مجازی مفہوم میں لینے کی کوشش کی ہے، انھوں نے علم کی دنیا میں اپنی جہالت کا پورا ثبوت دے دیا ہے۔

ہندو لڑکے سے مسلمان لڑکی کا شادی کرنا

سوال: کیا ہندو لڑکے کے ساتھ مسلمان لڑکی کا شادی کرنا جائز ہے؟ (محمد زبیر خان)

جواب: مسلمان مردوں کے لیے غیر مسلموں میں سے صرف اہل کتاب کی خواتین سے نکاح جائز ہے، اس سے آگے بڑھنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے خیال کے مطابق ہندو لڑکے کے ساتھ مسلمان لڑکی کا شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

نکاح اور طلاق کا شرعی طریق کار

سوال: نکاح اور طلاق کا شرعی طریقۂ کار کیا ہے؟ (محمد عمر بن عبداللہ)

جواب: دین میں نکاح اور طلاق کے حوالے سے جو احکام دیے گئے ہیں، استاذ محترم جاوید احمد غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''قانون معاشرت'' میں انھیں پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں اسی کتاب میں سے بعض اقتباسات ایک ترتیب کے ساتھ آپ کے پیش خدمت ہیں:

''نکاح

...علانیہ ایجاب و قبول کے ساتھ یہ مرد و عورت کے درمیان مستقل رفاقت کا عہد ہے جو لوگوں کے سامنے اور کسی ذمہ دار شخصیت کی طرف سے اس موقع پر تذکیر و نصیحت کے بعد پورے اہتمام اور سنجیدگی کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔(۱۳)

...نکاح مال یعنی مہر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ ایک فریضہ کی حیثیت سے یہ نکاح کی ایک لازمی شرط ہے۔ (۲۳)

مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی گئی۔ اسے معاشرے کے دستور اور لوگوں کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ عورت کی سماجی حیثیت اور مرد کے معاشی حالات کی رعایت سے وہ جتنا مہر چاہیں، مقرر کر سکتے ہیں۔ (۲۴)

...نکاح کے لیے پاک دامن ہونا ضروری ہے۔ کوئی زانی یہ حق نہیں رکھتا کہ کسی عفیفہ سے بیاہ کرے اور نہ کوئی زانیہ یہ حق رکھتی ہے کہ کسی مرد عفیف کے نکاح میں آئے، الاّ یہ کہ معاملہ عدالت میں نہ پہنچا ہو اور وہ توبہ و استغفار کے ذریعے سے اپنے آپ کو اس گناہ سے پاک کر لیں۔ (۲۴)

...یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ نکاح خاندان کے جس ادارے کو وجود میں لانے کے لیے کیا جاتا ہے، اس کی حرمت کا تقاضا ہے کہ یہ والدین اور سرپرستوں کو ساتھ لے کر اور ان کی رضامندی سے کیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نکاح میں فیصلہ اصلاً مرد و عورت کرتے ہیں اور ان کے علانیہ ایجاب و قبول سے یہ منعقد ہو جاتا ہے، لیکن اولیا کا اذن اگر اس میں شامل نہیں ہے تو اس کی کوئی معقول وجہ لازماً سامنے آنی چاہیے۔ یہ نہ ہو تو معاشرے کا نظم اجتماعی یہ حق رکھتا ہے کہ اس طرح کا نکاح نہ ہونے دے۔ (۲۶)

طلاق کا طریقہ

شوہر خود طلاق دے یا بیوی کے مطالبے پر اسے علیحدہ کر دینے کا فیصلہ کرے، دونوں ہی صورتوں میں اس کا جو طریقہ ان آیات میں بتایا گیا ہے، وہ یہ ہے:

ا۔ طلاق عدت کے لحاظ سے دی جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو فوراً علیحدہ کر دینے کے لیے طلاق دینا جائز نہیں ہے۔ یہ جب دی جائے گی، ایک متعین مدت کے پورا ہو جانے پر مفارقت کے ارادے سے دی جائے گی۔ عدت کا لفظ اصطلاح میں اس مدت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں بیوی شوہر کی طرف سے طلاق یا اس کی وفات کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔ یہ مدت چونکہ اصلاً مقرر ہی اس لیے کی گئی ہے کہ عورت کے پیٹ کی صورت حال پوری طرح واضح ہو جائے، اس لیے ضروری ہے کہ بیوی کو حیض سے فراغت کے بعد اور اس سے زن و شو کا تعلق قائم کیے بغیر طلاق دی جائے۔...(۵۸-۵۹)

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ عدت کا شمار پوری احتیاط کے ساتھ کیا جائے۔ طلاق کا معاملہ چونکہ نہایت نازک ہے، اس سے عورت اور مرد اور ان کی اولاد اور ان کے خاندان کے لیے بہت سے قانونی مسائل پیدا ہوتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ جب طلاق دی جائے تو اس کے وقت اور تاریخ کو یاد رکھا جائے اور یہ بھی یاد رکھا جائے کہ طلاق

کے وقت عورت کی حالت کیا تھی، عدت کی ابتدا کس وقت ہوئی ہے، یہ کب تک باقی رہے گی اور کب ختم ہو جائے گی۔

معاملہ گھر میں رہے یا خدانخواستہ کسی مقدمے کی صورت میں عدالت تک پہنچے، دونوں صورتوں میں اسی سے متعین کیا جائے گا کہ شوہر کو رجوع کا حق کب تک ہے، اسے عورت کو گھر میں کب تک رکھنا ہے، نفقہ کب تک دینا ہے، وراثت کا فیصلہ کس وقت کے لحاظ سے کیا جائے گا، عورت اس سے کب جدا ہو گی اور کب اسے دوسرا نکاح کر لینے کا حق حاصل ہو جائے گا۔

۲۔ عدت کے پورا ہونے تک شوہر کو رجوع کا حق ہے۔...(۵۹-۶۰)

۳۔ شوہر رجوع نہ کرے تو عدت کے پورا ہو جانے پر میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ ہدایت فرمائی ہے کہ یہ خاتمے کو پہنچ رہی ہو تو شوہر کو فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اسے بیوی کو روکنا ہے یا رخصت کر دینا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اللہ کا حکم ہے کہ معاملہ معروف کے مطابق، یعنی بھلے طریقے سے کیا جائے۔(۶۱)

...اس باب میں جو ہدایات خود قرآن میں دی گئی ہیں، وہ یہ ہیں:

اولاً، بیوی کو کوئی مال، جائداد، زیورات اور ملبوسات وغیرہ، خواہ کتنی ہی مالیت کے ہوں، اگر تحفے کے طور پر دیے گئے ہیں تو ان کا واپس لینا جائز نہیں ہے۔ نان و نفقہ اور مہر تو عورت کا حق ہے، ان کے واپس لینے یا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے علاوہ جو چیزیں دی گئی ہوں، ان کے بارے میں بھی قرآن کا حکم ہے کہ وہ ہرگز واپس نہیں لی جا سکتیں۔

اس سے دو صورتیں، البتہ مستثنیٰ ہیں:

ایک یہ کہ میاں بیوی میں حدود الٰہی کے مطابق نباہ ممکن نہ رہے، معاشرے کے ارباب حل و عقد بھی یہی محسوس کریں، لیکن میاں صرف اس لیے طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو کہ اس کے دیے ہوئے اموال بھی ساتھ ہی جائیں گے تو بیوی یہ اموال یا ان کا کچھ حصہ واپس کر کے شوہر سے طلاق لے سکتی ہے۔ اس طرح کی صورت حال اگر کبھی پیدا ہو جائے تو شوہر کے لیے اسے لینا ممنوع نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ بیوی کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کرے۔ اس سے میاں بیوی کے رشتے کی بنیاد ہی چونکہ منہدم ہو جاتی ہے، لہٰذا شوہر کے لیے جائز ہے کہ اس صورت میں وہ اپنا دیا ہوا مال اس سے واپس لے لے۔...(۶۳-۶۴)

ثانیاً، عورت کو ہاتھ لگانے یا اس کا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دی جائے تو مہر کے معاملے میں شوہر پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن مہر مقرر رہو اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق کی نوبت پہنچ جائے تو مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہو

گا، الا یہ کہ عورت اپنی مرضی سے پورا چھوڑ دے یا مرد پورا ادا کر دے۔...(۶۵)

ثالثاً، عورت کو کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کیا جائے۔...(۶۶)

۴۔ عدت کے دوران میں شوہر رجوع کر لے تو عورت بدستور اس کی بیوی رہے گی، لیکن اس کے معنی کیا یہ ہیں کہ شوہر اسی طرح جب چاہے بار بار طلاق دے کر عدت میں رجوع کر سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن نے یہ دیا ہے کہ طلاق اور طلاق کے بعد رجوع کا یہ حق ہر شخص کو ایک رشتۂ نکاح میں دو مرتبہ حاصل ہے۔...(۶۷)

...یعنی آدمی طلاق دے کر رجوع کر لے تو عورت کے ساتھ اس کی پوری ازدواجی زندگی میں اس کو ایک مرتبہ پھر اسی طرح طلاق دے کر عدت کے دوران میں رجوع کر لینے کا حق حاصل ہے، لیکن اس کے بعد یہ حق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ایک رشتۂ نکاح میں دو مرتبہ رجوع کے بعد تیسری مرتبہ پھر علیحدگی کی نوبت آ گئی اور شوہر نے طلاق دے دی تو اس کے نتیجے میں عورت ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گی، الا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہو اور وہ بھی اسے طلاق دے دے۔...(۶۸)

۵۔ شوہر طلاق دے یا رجوع کرے، دونوں ہی صورتوں میں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا ہے کہ اپنے اس فیصلے پر وہ دو ثقہ مسلمانوں کو گواہ بنا لے اور گواہوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اللہ کے لیے اپنی اس گواہی پر قائم رہیں۔...(۷۲-۷۳)

یہ طلاق کا صحیح طریقہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے مطابق اپنی بیوی کو علیحدہ کرتا یا علیحدگی کا فیصلہ کر لینے کے بعد اس کی طرف مراجعت کرتا ہے تو اس کے یہ فیصلے شرعاً نافذ ہو جائیں گے، لیکن کسی پہلو سے اس کی خلاف ورزی کر کے اگر طلاق دی جاتی ہے تو یہ پھر ایک قضیہ ہے جس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔"(۷۳)
